۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۰ء تک

ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی

رئیس القلم علامہ ارشد القادری کی ہمہ صفت شخصیت اور بے مثال خدمات کے چند ابتدائی اوراق

ترتیب و ایڈیٹنگ

خوشتر نورانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رئیس القلم علامہ ارشد القادری کی سیماب صفت شخصیت
اور بے مثال خدمات کے چند ابتدائی اوراق
(۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک)

ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی

ترتیب وایڈیٹنگ

خوشتر نورانی

نام کتاب	ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی
ترتیب وایڈیٹنگ	خوشتر نورانی
سال اشاعت	ستمبر ۲۰۰۷ء
ناشر	مکتبہ جام نور، دہلی
صفحات	56
قیمت	Rs[redacted]/-

Arshad ki kahani Arshad ki Zabani
Compiled & edited by
Khushtar Noorani

Maktaba jaam-e-Noor
422,Matia Mahal,Jama Masjid,Delhi
Ph.011-23281418 Tele-Fax· 23281418
e:mail- jnoormonthly@yahoo.com

اپنے دونوں بھائیوں

کوثر سمنانی

اور

منظر سمنانی

کے نام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلے اسے پڑھیے

داستان بے نیازی

بچپن کھیل کود اور لاشعوری میں گزرا، جب کچھ ہوش سنبھالا تو اپنے دادا جان حضرت علامہ ارشد القادری کی علمی جلالت ، فکری صلابت ، زبان وقلم کی شہنشاہیت ، قائدانہ صلاحیت ، سیاسی بصیرت ، مناظرانہ ہیبت ، خطیبانہ سطوت اور تعمیری ، تنظیمی وتحریکی خدمات کے بے شمار واقعات ہر چہار جانب سنا دیے- جبکہ ان کے ظاہری رکھ رکھاؤ اور سادگی کو دیکھ کر ایک معمولی عالم کا گمان گزرتا تھا، اس وقت چھوٹے سے دماغ میں فطری طور پر یہ خیال آتا کہ اتنا بڑا اور مشہور شخص جس کے سامنے بڑے بڑے سیاسی حکمراں ، علماء وفضلاء اور عوام وخواص سر جھکائے خاموش بیٹھتے ہیں ، جس کے علمی ، فکری اور تعمیری کارناموں کا سلسلہ اور شہرہ سرحد کی فصیلوں کو توڑ کر یورپ کے مختلف خطوں میں سنائی دے رہا ہے وہ اتنا " بے نیاز " اور " غریب " کیوں ہے؟ نہ اس کے پاس کوئی عالیشان گھر ہے ، نہ گاڑی ، نہ نوکر چاکر ، نہ بینک بیلنس ، نہ کوئی ٹھاٹ باٹ ـــ بس اگر کچھ ہے تو چند الماریوں میں مختلف موضوعات پر سیکڑوں کتابیں جو مدرسہ فیض العلوم جمشید پور کے داخلی حصہ میں ایک بیٹھک کے اندر دیواروں سے لگ کر قرینے سے بجی ہوئی ہیں ، جس بیٹھک کو " دارالاہتمام " بھی کہا جاتا ہے- اس میں وزرائے مملکت سے لے کر ایک معمولی انسان بھی اپنی فریاد لے کر بارگاہ میں پہنچتا ہے-

اور پھر رہنے کے لیے مدرسہ ہی کی طرف سے دیا گیا تین کمروں پر مشتمل ایک خستہ حال گھر جس کے ایک کمرے میں ایک پچاس سالہ پرانا پنکھا اپنی پوری قدامت کے ساتھ چل رہا ہے ، ایک کونے میں ایک کمزور چارپائی ہے جس پر معمولی بستر بچھا ہوا ہے اور

دوسرے کونے میں لوہے کی ایک زنگ آلود الماری جس میں ضروری فائل اور اہم کاغذات رکھے ہوئے ہیں اور چارپائی سے متصل ایک چٹائی بچھی ہوئی ہے جس پر وہ نماز پڑھتا ہے اور کھانا کھاتا ہے۔

اپنی تعلیم کے حصول کی وجہ سے میرا بچپن اپنے والدین سے زیادہ دادا میاں اور دادی جان کے پاس مدرسہ میں گزرا، جبکہ والدین اور گھر کے دوسرے افراد مدرسے سے دور دوسرے گھر میں رہتے تھے، دادا جان کی کھانے پینے اور دیگر سہولتوں کے لیے دادی جان کو مدرسہ میں ہی رہنا پڑتا تھا۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ مذہب وملت کی زلف برہم کی مشاطگی کے لیے وہ ہمیشہ فکرمند رہتے۔ ویسے تو اکثر وہ ملک و بیرون ملک کے تبلیغی و دعوتی اسفار پر رہتے، جب بھی وہ لوٹتے تو کبھی وہ کتابیں یا مضامین لکھنے میں شب وروز مصروف رہتے، کبھی دیابنہ کی سرکوبی کے لیے کسی مناظرہ کے لیے پابہ رکاب رہتے، کبھی کسی مدرسے کی تعمیر کے لیے منصوبے بناتے، کبھی کسی مسجد کے زمین کے حصول کے لیے حکومت پر دباؤ بنانے کی پلاننگ کرتے، کبھی ملک میں اہل سنت کے وجود کو مستحکم کرنے کے لیے کسی بڑی کانفرنس کے انعقاد کے لیے کوشاں رہتے، کبھی علماء اور پیران طریقت کے آپسی نزاع کے تصفیے کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیتے، کبھی کسی تنظیم کے قیام کے لیے منصوبہ بندی کرتے اور کبھی کسی مشن میں ناکامی ہوتی تو گھنٹوں شب کے اندھیرے میں مصلے پر بیٹھ کر ایک عابد شب زندہ دار کی صورت اپنے رب کے حضور گڑگڑاتے، آہ وزاریاں کرتے اور بلک بلک کر روتے۔ اہل سنت کی شیرازہ بندی کے لیے میں نے اکثر مصلے پر ان کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دیکھی۔ ملت کے غم میں ایسا جنون، ایسی سیماب صفت طبیعت اور ایسا دل دیوانہ ہم نے نہ دیکھا اور نہ سنا۔ کوئی بھی شخص جس کو تھوڑی دیر کے لیے بھی ان کی صحبت میسر آئی ہے ان کی مذہبی و مسلکی دیوانگی کی گواہی ضرور دے گا۔

اس دیوانگی نے انہیں اپنے اطراف جوانب سے، رشتے ناتوں سے، شہرت وناموری سے، مال ودولت سے اور جاہ وحشم سے بے نیاز کر رکھا تھا، وہ ایک سالک تھا جو اپنے ہی راہ میں گم تھا، ایک مجذوب تھا جو خود سے باتیں کرتا تھا اور ایک سچا درویش تھا جو اپنی قلندری میں خوش تھا۔

دین ومسلک کا کوئی کتنا ہی سچا اور مخلص خادم کیوں نہ ہو وہ اپنے خانگی زندگی سے بے پرواہ اور اپنے بچوں کی تعلیمی اور معاشی زندگی سے غافل نہیں ہوتا، دین ومسلک کی سر بلندی کے دھن میں اگر صدیوں میں ایسا کوئی شخص ہوا تو وہ ایک ہی تھا، جسے دنیا نے علامہ ارشد القادری کے نام سے جانا۔ مسلکی زوال کے غم نے کبھی انہیں اس فکر کی مہلت نہیں دی کہ ان کے گھر میں چولہا جلا بھی ہے یا نہیں، ان کے بچوں کے پاس تن ڈھانکنے کے لیے کوئی کپڑا بھی ہے یا نہیں، ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے والے گواہی دیں گے کہ فضاؤں میں یورپ کی خاک چھاننے والا اور ملت کی قیادت کرنے والا بے نیازی کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا کہ کئی مرتبہ ان کے بیوی بچوں نے فاقہ کشی میں دن گزارے، پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے اور معاشی بدحالی سے نجات پانے کے لیے معمولی کام بھی کیے اور دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ مسلکی تحفظ کے لیے گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ اور شہر شہر مہینوں خیمہ زن رہنے والا، اپنے بچوں کی شادیوں میں اس طرح شرکت کرتا ہے جیسے کوئی مہمان ہو۔

حضرت علامہ کی اس بے نیازی اور قلندری کا سلسلہ صرف ان کی ذات پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ ذات سے خانگی زندگی اور ان کے لازوال خدمات اور کارناموں تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ تگ ودو، مصائب وآلام، جدوجہد، فقر وفاقہ، بے سروسامانی، جفا کشی اور جہاد بالقلم سے عبارت تھا اور مستقبل کے مبلغین اور داعیان اسلام کے لیے مشعل راہ۔ لیکن جماعتی اور ملی فکر نے انہیں اپنی بے مثال کامرانیوں اور لافانی خدمات کو محفوظ کرنے سے اس قدر بے پرواہ کر دیا تھا کہ اب بیسویں صدی کے نصف آخر کی جماعتی اور ملی ارتقاء اور جدوجہد کی تاریخ لکھنے والے کو اس "غریب سادہ و رنگیں" کی داستان کا مربوط سلسلہ ڈھونڈھے نہیں ملتا۔ یہ سلسلہ ڈھونڈنا تو پڑے گا ورنہ جماعتی عروج وزوال کی پچاس سالہ تاریخ مکمل نہیں کی جا سکے گی۔

حضرت علامہ کا اپنی خدمات کو قلم بند نہ کرنے سے ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ کچھ محسن کش اداروں نے ان کی بے مثال قربانیوں کو فراموش کر دیا، کچھ بددیانت قلم کاروں نے ان کے عظیم کارناموں کو دوسروں کے نام سے منسوب کیا اور کچھ نام نہاد وفاداروں نے ان کے قائم کردہ مراکز اور کانفرنسوں کی تاریخ اس طرح پیش کرنی شروع کر دی کہ گویا ان کے

قیام اور انعقاد میں حضرت علامہ کی حیثیت محض ایک مشیر یا مندوب کی تھی۔ لیکن شاید ایسے شرفاء یہ بھول گئے کہ کچھ سفر کے نشانات غبار راہ میں گم نہیں ہوتے بلکہ اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ مٹانے پر نہیں مٹتے۔

آج حضرت مولانا بدر القادری (ہالینڈ) کے لیے دل سے بے پناہ دعائیں نکل رہی ہیں جنہوں نے برسوں پہلے حضرت علامہ کی افسانوی زندگی کی داستان محفوظ کرنے کے لیے تقریباً دو سو سوالات ترتیب دیے اور حضرت علامہ کی مصروف ترین زندگی کے پیش نظر یہ چاہا کہ جب موقع ہاتھ لگے بشکل انٹرویو ان کے شخصی احوال اور جماعتی کارناموں کو محفوظ کر لیا جائے۔ اتفاق سے ۱۹۸۸ء میں حضرت علامہ اپنے تبلیغی مشن کے لیے ہالینڈ تشریف لے گئے جہاں انہوں نے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا جو مختلف نشستوں میں پانچ کیسٹوں میں محفوظ ہو گیا۔ یہ داستان ۱۹۲۵ء میں ان کی ولادت، عہد طفلی، خانگی احوال، تعلیمی زندگی اور مبارکپور کے ابتدائی حالات سے لے کر ۱۹۵۰ء تک ان کی تدریسی زندگی، ازدواجی زندگی اور جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے لیے عظیم خدمات پر مشتمل ہے۔ ان کی جماعتی سرگرمیوں نے وہاں یا اس کے بعد انہیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ مولانا بدر القادری صاحب کے ترتیب کردہ تمام سوالات کا جواب دیتے، اگر وہ اتنی مہلت دیتے تو یقیناً ان کے کارناموں کی تمام نامعلوم کڑیاں مل جاتیں، مگر افسوس!

حالانکہ ۱۹۵۰ء کے بعد ہی حضرت علامہ کی دینی، ملی، سیاسی، قلمی، صحافتی اور تعمیری زندگی کا آغاز ہوتا ہے جس کا سلسلۂ ذہب پانچ دہائیوں پر مشتمل ہے، اس طویل عرصے میں انہوں نے سواد اعظم اہل سنت و جماعت کے تحفظ کے لیے دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف فرمائی، کئی تاریخی اور علمی مناظرے کر کے جماعت کو فتح و کامرانی سے ہم کنار کیا، ہندوستان سے لے کر بیرونی ممالک تک مدارس و مساجد کا جال بچھا دیا، ملت کے معاشی، مذہبی اور تعلیمی حقوق کی بازیابی کے لیے کئی تاریخی کانفرنسیں منعقد کیں، مسلم پرسنل لاء کے تحفظ اور جماعتی استحکام کے لیے کئی ملکی اور غیر ملکی سطح کی تنظیموں اور تحریکوں کی بنیاد ڈالی، ہندوستان میں مسلم اقلیت کے حقوق کے لیے سیاسی حکمرانوں کو اہم فیصلے لینے پر مجبور کیا، مذہبی صحافت کو فروغ دینے کے لیے کئی رسالوں کا اجراء کیا اور نہ جانے کیا کیا۔

اس لیے جو کچھ بھی اس کتاب میں ہے وہ ان کے ابتدائی حالات ہیں، لیکن جماعتی جد وجہد کی تاریخی کڑی کو جوڑنے کے لیے کسی سرمایہ سے کم نہیں۔ کیسٹوں میں محفوظ یہ ابتدائی داستان مولانا بدر القادری صاحب کے پاس اٹھارہ برسوں سے رکھی ہوئی تھی، جس کو انہوں نے اپریل ۲۰۰۶ء میں ہمارے حوالے کیا، ہم نے اس کی نقل، ترتیب اور ایڈیٹنگ کا کام اولین فرصت میں شروع کر دیا، کافی محنتوں کے بعد یہ کام ایک ماہ کی مدت میں مکمل ہوا اور پھر ماہنامہ جام نور دہلی کے شمارہ جون ۲۰۰۶ء سے نومبر ۲۰۰۶ء تک مسلسل چھ قسطوں میں یہ شائع ہوا۔ افادۂ عام اور ریسرچ اسکالروں کی سہولت کے لیے اب ہم اسے کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں۔ لیجیے کتاب حاضر ہے! اشک بار آنکھوں سے بیسویں صدی کے ایک عظیم مصنف، مبلغ، مناظر، قائد اور عالم کی داستانِ شوقِ رہ نوردی پڑھیے اور سوچیے کہ ہم مذہب و مسلک کی شیرازہ بندی کے لیے کیا کر رہے ہیں۔

خوشتر نورانی

۱۸ راگست ۲۰۰۷ء

سوال: -اپنی تاریخ پیدائش اور سنہ ولادت سے آگاہ فرمائیں؟

جواب: -میری ولادت کی صحیح تاریخ تو مجھے یاد نہیں ہے، لیکن اپنے بزرگوں سے سنا کہ میری پیدائش غالباً ۱۹۲۵ء میں یوپی میں ضلع بلیا کے ایک گاؤں پورہ میں ہوئی، مگر جب ایک بزرگ سید صاحب وہاں تشریف لائے جو مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی علیہ الرحمہ کے مرید وخلیفہ تھے اور وہیں اقامت گزیں ہو گئے اور پھر ان کا انتقال بھی وہیں ہوا اور ان کا مزار بھی بن گیا، اس کے بعد سے لوگ اس گاؤں کو سید پورہ کہنے لگے۔

سوال: -آج کل سید پورہ کس تحصیل، تھانے اور ڈاک خانے کے تحت آتا ہے؟

جواب: -یہ غالباً تحصیل بانس ڈیہہ، تھانہ سکندر پور اور پوسٹ کھڑسرا کے تحت ہے۔

سوال: -حضرت! آپ اپنے اسم گرامی، لقب اور تخلص وغیرہ کے متعلق کچھ بتائیں؟

جواب: -میرے والد مولانا شاہ عبداللطیف صاحب نے بتایا کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو مجھے ام الصبیان ہو گیا تھا یعنی میرے ہاتھ پاؤں بالکل اکڑ گئے اور جسم کا خون بالکل منجمد ہو گیا، میری آواز ختم ہو گئی اور میں مرنے کے بالکل قریب ہو گیا تو میرے والد ماجد مولانا شاہ عبداللطیف صاحب رشیدی جو سلسلۂ رشیدیہ میں حضرت علامہ آسی غازی پوری علیہ الرحمہ سے مرید تھے، اس سلسلے میں ایک جید عالم دین اور بزرگ صفت شخصیت حضرت مولانا مصطفیٰ رشید گزرے ہیں جن کی مشہور زمانہ تصنیف ''مناظرۂ رشیدیہ'' ہے، والد صاحب فرماتے ہیں کہ'' جب میری ایسی حالت ہو گئی تو میں نے تمہیں حضرت سرکار مصطفیٰ رشید کی غلامی میں دے دیا اور انہی سے منسوب کر کے تمہارا نام غلام رشید رکھ دیا، پھر میں نے قلبی توجہ کے ساتھ عرض کیا کہ حضور! میں نے اسے آپ کی غلامی میں دے دیا ہے، اب آپ اس کی حفاظت فرمائیں۔'' اس کے بعد میں بالکل اچھا ہو گیا۔

میرا نام تو غلام رشید ہے، لیکن میرے عہد طالب علمی میں جامعہ اشرفیہ مبارکپور میں طلبہ کے درمیان ایک مشاعرہ ہوا، یہ دیکھنے کے لیے کہ کس طالب علم میں قوت شعروسخن ہے اور کتنی ہے، اس میں ایک مصرع طرح دیا گیا اور مشاعرہ کی ایک تاریخ مقرر ہو گئی، اس مصرع پر کبھی طلبہ طبع آزمائی کرنے لگے، انہیں دیکھ کر مجھے بھی شوق ہوا کہ میں بھی اس میں کچھ حصہ لوں، چنانچہ میں نے بھی چند اشعار لکھے، اشعار تو لکھ لیے، لیکن اس وقت تک میں

نہیں جانتا تھا کہ تخلص کیا چیز ہوتی ہے، ساتھیوں کی آپس میں گفتگو سے پتہ چلا کہ اشعار میں تخلص بھی ہونا چاہیے، اسی وقت مطلع، قوافی، ردیف کا علم ہوا اور ساتھ ہی تخلص کا بھی، اس وقت عروض سے واقفیت نہیں تھی اس لیے تغنی کے ذریعے یعنی گنگنا کر ہم نے شعر کا وزن قائم کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میدان کے تمام مبتدی اسی طرح سے اپنے اشعار کا وزن قائم کرتے ہیں، بہر حال اس مشاعرہ کے لیے سب کچھ تو ہو گیا، لیکن جب میں مقطع پر آیا تو غلام رشید وزن میں آ ہی نہیں رہا تھا (قہقہہ لگاتے ہوئے) تو پھر میں نے کوشش کی کہ رشید بیٹھ جائے لیکن وہ بھی وزن میں نہیں بیٹھ رہا تھا۔ پھر میں نے ارشد کے ساتھ کوشش کی تو وہ وزن میں آ گیا، پھر یہ کہ ارشد حضرت مصطفیٰ رشید علیہ الرحمہ کے صاحبزادے کا نام تھا، میں نے سوچا کہ کیوں نہ ارشد تخلص رکھ لیا جائے تاکہ والد اور صاحبزادے دونوں کی برکتوں سے استفادہ کروں، لہٰذا میں نے اپنا تخلص ارشد رکھ لیا، یہ تخلص مشہور ہوتا گیا اور مشہور ہوتے ہوتے اتنا ہوا کہ غلام رشید چھپ گیا۔

میرے عہد طالب علمی میں جب حافظ ملت علیہ الرحمہ مبارکپور سے ناراض ہو کر جامعہ عربیہ ناگپور بحیثیت شیخ الحدیث تشریف لے جا رہے تھے تو اپنے مخصوص چار تلامذہ مولانا شاہ عبدالحق، مولانا قاری مصلح الدین، مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب اور مولانا مفتی ظفر علی نعمانی صاحب کو جو درس نظامیہ کے آخری سال میں تھے، اپنے ہمراہ لے گئے، مجھے چونکہ حضرت بہت مانتے تھے اور مجھ پر بڑی شفقت کی نظر فرماتے تھے، اس لیے اپنے ساتھ مجھے بھی لے گئے۔ جامعہ عربیہ میں پہنچ کر حضرت نے دورۂ حدیث کے طلبہ کو پڑھانا شروع کیا تو یہ چاروں تلامذہ بھی اس میں شامل ہو گئے، جب تعلیمی سال ختم ہوا تو جامعہ عربیہ کے بانی و مہتمم مفتی عبدالرشید خان صاحب نے جلسۂ دستار بندی کے لیے اہل سنت کے تین اکابر علماء کو مدعو کیا، حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی صاحب کو بلوایا کیونکہ مفتی صاحب ان کے شاگرد تھے، حضرت محدث اعظم ہند کو بلوایا کیونکہ وہ جامعہ عربیہ کے سرپرست تھے اور حضرت صدر الشریعہ کو بلوایا کیونکہ وہ حافظ ملت کے استاذ تھے، تو اس موقع پر ناگپور سے قریب چھندواڑہ ایک پہاڑی علاقہ ہے وہاں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا، وہاں حضرت صدر الشریعہ کے متوسلین تھے جو میمن جماعت سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے بہت

اصرار کیا کہ حضرت اس جلسہ میں شریک ہوں، ان کے اصرار پر حضرت وہاں تشریف لے گئے، ان کے ساتھ مذکورہ چاروں تلامذہ اور میں بھی گیا، پھر وہیں ہم سبھی حضرت کے ہاتھ پر سلسلۂ قادریہ میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد میں قادری لکھنے لگا، اس طرح سے میرا نام ''ارشد القادری'' ہو گیا۔

سوال: -کیا آپ کی شاعری کی ابتدا اسی مشقی مشاعرے سے ہوئی؟

جواب: - جی ہاں! لیکن میری شاعری اس وقت نکھری جب جامعہ اشرفیہ کی دوسری منزل کا چندہ مبارکپور میں ہونے لگا، مبارکپور میں چندہ کرنے کا رواج بڑا دلچسپ تھا، وہاں چندہ کرنے کے لیے نظمیں پڑھی جاتی تھیں، ایک ایک گھر کے دروازے پر حافظ ملت، جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ کھڑے ہو جاتے تھے اور چندے کی رجزیہ نظمیں پڑھی جاتی تھیں، خاص طور پر حافظ ملت جب نکلتے تھے تو اس کا خاص اور بڑا گہرا اثر پڑتا تھا، اس موقع پر میں بھی خوب نظمیں لکھا کرتا تھا، اس وقت کچھ اس طرح کی نظمیں لکھی جاتی تھیں:

ہم اپنا مال و زر نذر تمنا کر کے چھوڑیں گے
تمام اغیار کو محو تماشا کر کے چھوڑیں گے
تمہیں ہم قیس کی مانند شیدا کر کے چھوڑیں گے
ہم اپنے مدرسے کو رشک لیلیٰ کر کے چھوڑیں گے
مبارکپور کا روشن ستارا کر کے چھوڑیں گے

ایک دن میری نظم بھی کافی موثر ہوگئی اور خوب چندہ ہوا، یوں سمجھ لیجیے کہ روپے برسنے لگے، ایک دو اشعار اس میں ایسے تھے کہ لوگ اس کو بار بار پڑھواتے اور خوب نعرے لگاتے، نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر، نعرۂ رسالت، یا رسول اللہ، اس وقت حافظ ملت پر بھی ایک عجیب رقت طاری ہوگئی، جب مقطع پڑھا گیا تو اس میں ارشد کا نام آیا، حافظ ملت نے پوچھا کہ یہ ارشد کون ہے؟ کسی نے کہا کہ وہ غلام رشید ہے، فرمایا کہاں ہے؟ بلاؤ بلاؤ، میں قریب ہی اپنی نظم سننے کے لئے کھڑا تھا، (ہنستے ہوئے) خیر میں آیا تو حضرت نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور انعام بھی دیا، جس سے اور بھی اشتیاق بڑھا، مگر یہ بالکل ایک ضمنی چیز تھی، گویا یہ میرا اوڑھنا بچھونا نہیں بنا۔

سوال:- اس وقت آپ کی عمر کیا رہی ہوگی؟

جواب:- غالباً گیارہ یا بارہ برس کی عمر تھی۔

سوال:- اپنے ابتدائی تعلیمی حالات، گھریلو حالات اور اکابرین خانہ کے تعلق سے کچھ اہم واقعات ہوں تو بتائیں؟

جواب:- جب میں کافی چھوٹا تھا تو میرے گاؤں میں ایک پرائمری اسکول ہوا کرتا تھا، اس میں میرا داخلہ ہو گیا، چونکہ اس وقت میں کافی چھوٹا تھا اور باہر جانے کے قابل نہیں تھا، اس لیے میں نے وہاں درجہ سوم تک پڑھا، اس کے بعد میرے والد نے مجھے مولانا عظیم اللہ صاحب کے پاس جو رشتے میں میرے دادا لگتے تھے، گورہٹی بنگال جہاں وہ پڑھایا کرتے تھے، بھیج دیا، وہ ایک زبردست خطیب اور نہایت منجھے ہوئے مدرس تھے، نحو وصرف ان کے خاص موضوع تھے، ان پر وہ ایسا درس دیتے تھے کہ جس کو انہوں نے پڑھا دیا وہ ان فنون میں یکتائے روزگار ہو جایا کرتا تھا، ان کے پڑھانے کا ایک خاص انداز تھا، وہ کتابیں پڑھانے سے زیادہ لکھواتے اور مشق وتمرین کرایا کرتے تھے۔ یہ بھی حضرت سرکار آسی علیہ الرحمہ کے مرید تھے اور گورہٹی بنگال کی ایک مسجد کے خطیب بھی تھے۔ بہر کیف جب میں وہاں پہنچا تو اردو وغیرہ تو اپنے گاؤں سے پڑھ کر گیا تھا، اس لیے وہاں فارسی کی پہلی اور آمدنامہ سے شروعات کی، اس وقت ان کے درس میں مفتی ظفر علی نعمانی صاحب، میرے بڑے بھائی مولانا غلام آسی صاحب اور مولانا عظیم اللہ صاحب کے صاحبزادے مولانا علیم اللہ مرحوم جو میرے چچازاد بھائی تھے، پنج گنج وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ مولانا علیم اللہ نے ہدایۃ النحو تک دادا سے پڑھا اور پھر مرادآباد چلے گئے، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی کے خاص شاگرد تھے اور ان کی فراغت جامعہ نعیمیہ مرادآباد سے ہی ہوئی، عہد شباب میں ان کی زبردست اٹھان تھی اور انہیں علم حدیث پر زبردست عبور تھا، یہ اس وقت بنگال کی مشہور جامع مسجد ''ناخدا مسجد'' میں مفسر قرآن کی حیثیت سے رکھے گئے اور یہ وہاں قرآن کا درس دیا کرتے تھے، اس کے ساتھ یہ ایک نہایت نکتہ رس مشہور خطیب تھے، ان کی زبان نہایت سلیس تھی اور اپنی تقریروں میں اتنے علمی نکات بیان کرتے تھے کہ لوگ دور دور سے انہیں سننے آیا کرتے تھے، وہاں کے لوگ بتاتے ہیں کہ ان دنوں ابوالکلام آزاد بھی وہاں تھے

اور اپنا رسالہ ''الہلال'' وہاں سے نکالا کرتے تھے،ان کی تقریر کی شہرت جب ان کے کانوں تک پہنچی تو وہ بھی بعض دفعہ آس پاس کہیں بیٹھ کر کے ان کی تقریر سنا کرتے۔

مولانا علیم اللہ صاحب مرحوم ایک سچے عاشق رسول بھی تھے، جب یہ دلائل الخیرات شریف پڑھا کرتے تو ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی تھیں،ان کے مذہبی رجحانات اور بے پناہ صلاحیتوں کو دیکھ کر ہمارے دادا مولانا عظیم اللہ صاحب کہا کرتے تھے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ ''میں تمہیں جامع ازہر قاہرہ بھیج دوں'' تو میرے بھائی مولانا علیم اللہ صاحب نے فرمایا کہ'' مجھے قاہرہ بھیج کر کیا کریں گے؟ الحمد للہ میں ہندوستان میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی روح سے استفادہ کرتا ہوں'' ان کے بارے میں کہا بھی جاتا ہے کہ انہیں کسی علم سے زیادہ وہبی علم تھا۔ان کے بڑے بھائی مولانا عزیز اللہ صاحب یہ بھی بردوان بنگال کی ایک مسجد کے خطیب اور مدرس تھے اور سلسلۂ رشیدیہ میں حضرت سبز پوش رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جونپور شریف سے بیعت تھے،ان پر اکثر جذبی کیفیت طاری رہتی تھی اور یہ ایک ولی صفت اور بزرگ صفت تھے،ان کے حوالے سے کئی واقعات مشہور ہیں۔

ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ آیا تو جس مسجد میں یہ امام تھے وہاں کوئی حافظ کا انتظام نہیں ہوسکا، جب شعبان کی ۲۹ر تاریخ آئی تو ان کی مسجد کے نمازی بہت افسوس کرنے لگے کہ اس سال کسی حافظ کا انتظام نہ ہوسکا، ہائے! اس سال ہم لوگ تراویح سے محروم رہ جائیں گے اور ہم لوگ قرآن سن نہیں سکیں گے،اس وقت مولانا عزیز اللہ صاحب پر جذبی کیفیت کم تھی، یہ سن کر انہوں نے کہا کہ اس میں افسوس کرنے کی کیا بات ہے، میں پڑھاؤں گا، حالانکہ وہ حافظ قرآن نہیں تھے،اس دن انہوں نے ایک پارہ حفظ کیا اور سنایا اس طرح روز ایک پارہ حفظ کرتے تھے اور سناتے تھے،اس طرح وہ تیس دنوں میں حافظ قرآن ہو گئے۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کے ناظم الدین سہروردی بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے جو ان کے بڑے معتقد تھے، جس وقت مسلم لیگ کی وزارت بنگال میں تھی تو ان کا ایک واقعہ ان کے حوالے سے اور بھی مشہور ہے کہ کسی دینی مسئلہ پر اسمبلی میں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی،اس میں شرط یہ لگائی کہ انگریزی میں تقریر کرنی ہوگی، حالانکہ انہوں نے انگریزی پڑھی نہیں تھی،وہ فرماتے ہیں کہ'' اس نازک موقع پر میں نے حضرت سرکار آسی اور حضرت دیوان جی مصطفیٰ رشید رضی

اللہ عنہما کی طرف توجہ کی اور کھڑا ہو گیا اور پھر فرانے سے انگریزی میں تقریر کردی۔"

بات بہت طویل ہوگئی، میں بتا رہا تھا کہ مجھے میرے والد صاحب نے دادا کے پاس گورینی پڑھنے کے لئے بھیجا، مجھے یاد آتا ہے کہ گلستاں بوستاں تک میں نے وہاں پڑھا، اس زمانے میں جس دن مجھے سبق یاد نہیں رہتا تھا تو دادا کے یہاں ایک چھوٹا بچہ تھا جس کی عمر ایک یا ڈیڑھ سال کی ہوگی، اسے میں گود میں لے لیا کرتا تھا اور گود میں لے کر چیونٹی کاٹ لیا کرتا تھا، جیسے ہی اسے تکلیف ہوتی وہ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتا تھا، اور اسی حالت میں میں اسے دادا کے پاس لے جاتا تو وہ اس کی چیخ وپکار سے پریشان ہو جاتے تھے، اور پھر کہتے کہ ارے لے جاؤ اسے باہر، میں اسے باہر لے کر چلا جاتا تھا، پھر جیسے ہی وہ کچھ دیر میں چپ ہو میں پھر اسے چیونٹی کاٹ لیتا اور پھر وہ رونا شروع کر دے (خوب قہقہہ لگاتے ہوئے) اس طرح مجھے سبق سنانے کا موقع نہیں آتا تھا۔ یہ حربہ کبھی کبھی استعمال کرنا پڑتا تھا، کیوں کہ جب سبق یاد نہیں ہوتا تھا تو دادا بہت پٹائی کیا کرتے تھے، خیر اس حربے کے استعمال سے ہمارا وہ دن خیریت سے گزر جاتا تھا، پھر رات کو سبق یاد کر لیتا تھا اور دوسرے دن سنا دیتا تھا۔

سوال:- گھر میں والدین اور اکابرین خانہ آپ کو پیار سے کس نام سے پکارتے تھے؟

جواب:- پیار سے مجھے گھر والے غلام رشید ہی کہا کرتے تھے، ان لوگوں نے کبھی میرے نام کو بگاڑا نہیں تھا، اب بھی میری بڑی بہن جو حضرت صدر الشریعہ کی اہلیہ ہیں وہ مجھے غلام رشید ہی کہتی ہیں۔ (اہلیہ حضرت صدر الشریعہ کا انتقال دسمبر ۱۹۹۴ء میں گھوسی ضلع مئو یوپی میں ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی: نورانی) ارشد نہیں کہتی اور میرے بڑے بھائی مولانا غلام آسی صاحب بھی مجھے غلام رشید ہی کہتے ہیں (حضرت مولانا غلام آسی علیہ الرحمہ کا انتقال جنوری ۲۰۰۳ء میں دہلی کے ایک ہاسپٹل میں ہوا اور ان کی تدفین قصبہ اترولہ ضلع بلرام پور یوپی میں ہوئی: نورانی)

خیر گورینی میں گلستاں و بوستاں تک پڑھنے کے بعد میں واپس اپنے گاؤں پورہ چلا گیا، جب میں گھر آیا اس وقت میری عمر آٹھ برس کی ہوگی، اس وقت میری والدہ کا انتقال ہو گیا، والدہ کے انتقال کے بعد میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا، اس زمانے میں میرے والد

صاحب تجارت کی غرض سے صوبۂ بہار کے ایک شہر دھنباد میں رہا کرتے تھے (دھنباد اب صوبۂ جھارکھنڈ میں ہے: نورانی)

والدہ کے انتقال کے بعد گھر میں کوئی بھی نہیں تھا جو میری پرورش کرتا، تو میرے والد صاحب نے دوسری شادی کی اور سب لوگوں کو لے کر وہ گاؤں سے دھنباد چلے آئے۔ میرے والد ماجد علیہ الرحمۃ والرضوان ایک سچے عاشق رسول، عاشق غوث اور عاشق مرشد تھے، کبھی کبھی تو ایسا ہوا کرتا تھا کہ رات کو اچانک اٹھتے اور رونے لگتے ور پھر ہم دونوں بھائیوں مولانا غلام آسی صاحب اور مجھے بلاتے اور حضرت سرکار آسی کا دیوان عین المعارف دیتے اور کہتے کہ اس کے اشعار پڑھ کر سناؤ، جیسے جیسے ہم پڑھتے جاتے ان پر رقت طاری ہوتی چلی جاتی تھی، پھر وہ بہت دیر تک روتے رہتے تھے، ہماری اس وقت سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ بلا وجہ بیٹھے بٹھائے رات کو ایک بجے اور دو بجے یہ روتے کیوں ہیں؟ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میرے چچازاد بھائی مولانا یحییٰ جن کے بڑے بیٹے علی اکرم جو کراچی میں ہیں، حج کے لیے گئے تو مدینہ طیبہ سے انہوں نے والد صاحب کو خط بھیجا، اس خط میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ''میں روزانہ رات و دن میں پانچ بار حضور کے دربار میں حاضری دیتا ہوں اور آپ کا نام لے کر صلوٰۃ و سلام پیش کرتا ہوں'' بس جب اس سطر پر وہ پہنچے تو ان پر رقت طاری ہوگئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے، فرماتے کہ ''ہائے! میرا نام اور سرکار کے دربار میں لیا جارہا ہے؟ میرا نام اور حضور کی بارگاہ میں لیا جارہا ہے؟ میرا نام اور حضور کی جناب میں لیا جارہا ہے؟'' پھر مجھے بلایا اور کہا کہ یہ خط پڑھو، تو میں شروع سے پڑھنے لگا تو فرمایا نہیں، وہ سطر پڑھو کہ ''میں رات و دن میں پانچ بار حضور کے دربار میں حاضر ہوتا ہوں اور آپ کا نام لے کر سلام پیش کرتا ہوں'' بس اس سطر کو انہوں نے بیس پچیس مرتبہ پڑھوایا اور جیسے جیسے میں پڑھتا جاتا تھا، ویسے ویسے ان کی رقت اور آتش شوق بھڑکتی جاتی، یہاں تک کہ ایک گھنٹے تک وہ روتے رہے، تمام محلے کے لوگ جمع ہوگئے کہ یہ اتنا چیخ چیخ کر کیوں رو رہے ہیں، لیکن ان کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

ایک مرتبہ میرے بھائی صاحب مولانا غلام آسی حج کے لیے تشریف لے گئے، وہ جب بھی مدینے طیبہ تشریف لے جاتے ہیں تو جوتے نہیں پہنتے بلکہ ننگے پاؤں چلتے ہیں، تو

صفہ چبوترے پر مدینے کے جو خدام بیٹھتے ہیں ان سے ان کی دوستی ہوگئی، یہ بھی ایک عاشق رسول ہیں، اس لیے جب یہ وہاں گئے تو خوب روتے تھے اور ایک جذبی کیفیت ان پر رہتی تھی، ان کی کیفیت کو دیکھ کر ان میں سے کسی ایک نے ان کو حضور کے دربار کی جھاڑ وعطا کردی جس سے روضۂ پاک میں جھاڑو دی جاتی تھی، اس عطا پر وہ پھولے نہیں سماتے تھے، یہ اس کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر گھر لے آئے اور والد صاحب کو لا کر انہوں نے دے دیا اور بتایا کہ بہت دنوں تک اسی جھاڑو سے حضور کی جالی مبارک کے اندر سے صفائی کی جاتی رہی، مگر جب یہ ان کی نظر میں پرانا اور بےکار ہوگیا تو انہوں نے مجھے دے دیا، ابھی انہوں نے یہ بتا کر اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ اسے آنکھوں سے لگا کر والد صاحب بےتحاشہ رونے لگے، کبھی وہ اسے اپنے سینے پر رکھتے، کبھی سر پر رکھتے، پھر برسوں تک ان کا یہی مشغلہ تھا کہ صبح و شام وہ صندوق سے اس جھاڑو کو نکالتے اور پھر اسے آنکھوں سے لگاتے اور خوب روتے، بھائی صاحب کو بہت دنوں تک وہ کہیں جانے نہیں دیتے تھے اور بار بار بیٹھا کر پوچھتے تھے کہ تم مدینہ شریف جب گئے تو یہ بتاؤ کہ تم وہاں کس وقت پہنچے؟ اور یہ بتاؤ کہ حضور کا سبز گنبد سب سے پہلے کہاں سے نظر آتا ہے؟ اور جب پہلی بار نظر آیا تو تم کو کیسا لگا؟ مدینے کی گلیاں کیسی ہیں؟ وہاں کے باغات کیسے ہیں؟ حضور کے روضۂ پاک پر جانے کے لیے کتنے دروازے ہیں؟ بار بار بھائی صاحب سے وہ ان سوالات کو پوچھتے اور روتے رہتے، یہاں تک کہ انہوں نے ایک دن کہا کہ میاں! اب ہندوستان میں دل نہیں لگتا، چلو غلام آسی سب لوگ وہیں چلتے ہیں، عرصے تک وہ ایک ہی بات کی رٹ لگائے رہے کہ چلو سب چھوڑ کر وہیں چلتے ہیں، پھر وہ گھر کا ساز و سامان ایک ایک کر کے فروخت کرنے لگے، جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ ان پر ایک عجیب دیوانگی طاری ہے اور مدینے جانے کی دھن میں اپنا سب کچھ بیچتے جارہے ہیں، تو ان سے پوچھا کہ مولانا صاحب! جانے کے لیے کرایہ چاہیے، زاد راہ چاہیے اور سامان سفر چاہیے، یہ سب کچھ آپ کے پاس ہے؟ تو فرمایا کہ میاں! جس کے یہاں جس نیت سے جارہے ہیں، وہی ہمارے ناصر و مددگار ہیں، پہنچ گئے تو پہنچ گئے اور اگر نہیں پہنچ سکے اور راستے میں مرگئے تو یہ حسرت تو نہیں رہے گی کہ ان کی راہ میں قدم نہیں اٹھائے؟ یہاں تک کہ جب جذبی کیفیت کچھ کم ہوئی تب انہیں پتا چلا کہ جانے

کے لیے کیا کیا کرنا پڑے گا؟ لوگوں نے بتایا کہ جب تک آپ کو Permit نہیں ملے گا آپ ایک ملک سے دوسرے ملک نہیں جا سکتے، اس لئے آپ پہلے Permit حاصل کیجیے، پھر اس کے لئے انہوں نے کوششیں شروع کر دیں اور کئی مہینے اس میں گزر گئے، پھر بھائی صاحب تعلیم و تعلم کے سلسلے میں چلے گئے۔

ہمارے والد ماجد کو اپنے پیر و مرشد حضرت سرکار آسی غازی پوری علیہ الرحمہ اور خانقاہ رشیدیہ جونپور سے بھی بڑی عقیدت اور بے پناہ عشق تھا، وہاں پر رشید آباد میں ہی حضرت مصطفیٰ رشید دیوان جی علیہ الرحمہ اور ان کے صاحبزادے حضرت ارشد کا مزار مبارک بھی ہے، تو کبھی کبھی ہمارے والد صاحب وہاں جایا کرتے تھے، ان کو اپنے پیروں اور رشید آباد سے ایسی عقیدت تھی کہ جب نہیں جا پاتے تو بے چین ہو جاتے اور ایک ٹرین دہرادون ایکسپریس جو دہرادون سے چل کر جونپور ہوتے ہوئے دھنباد سے گزرتی تھی تو ٹرین کے وقت پیدل دھنباد اسٹیشن پر چلے جاتے تھے، اس زمانے میں پلیٹ فارم ٹکٹ ایک آنے میں ملتا تھا، ایک آنے کا وہ پلیٹ فارم ٹکٹ لیتے تھے اور پلیٹ فارم پر کھڑے ہو جاتے، جیسے ہی گھنٹی بجتی کہ دہرادون ایکسپریس آرہی ہے، ان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگتا اور طبیعت میں رقت پیدا ہونے لگتی، پھر جیسے ہی ٹرین کا انجن نظر آتا تو رونے لگتے اور کہتے کہ واہ! یہ میرے سرکاروں کے دیار سے آرہی ہے، میرے آقاؤں کی دیواروں کو چھوتی ہوئی آرہی ہے، وہاں کی فضاؤں سے مس ہو کر آرہی ہے، جب ٹرین آکر کھڑی ہو جاتی تو انجن دیکھتے، چھوتے اور چومتے، جب تک وہ ٹرین چلی نہیں جاتی وہ کھڑے رہتے۔

سوال:- کیا والد صاحب کو زیارت حرمین طیبین نصیب ہوئی؟

جواب:- نہیں! وہ فرماتے تھے کہ اگر میں وہاں گیا تو زندہ پلٹ کر نہیں آسکتا، وہ فرماتے تھے کہ میں تعجب کرتا ہوں کہ کوئی وہاں جا کر پلٹ کر واپس کیسے آتا ہے؟

ان کو حضرت غوث پاک رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی عقیدت و محبت تھی کہ ہر ماہ کی گیارہ تاریخ کو وہ بکرا ذبح کرتے تھے، اس کی بریانی بنواتے اور پھر حضرت غوث پاک کی فاتحہ بڑے اہتمام سے کیا کرتے تھے اور فاتحہ بھی تین تین چار چار گھنٹے تک کیا کرتے، اس دوران ان پر ایسی رقت طاری ہوتی تھی کہ وہ گھنٹوں زار و قطار رویا کرتے تھے، شب و روز

ان کے حالات کو دیکھ کر لوگ پوچھا کرتے تھے کہ مولانا! آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ فرماتے تھے کہ ہر ماہ یہی گیارہویں کی محفل کا اہتمام کرنا، یہی میرا ذریعہ معاش ہے، اس کے بعد سرکار میری کفالت فرماتے ہیں۔ ہر ماہ کی گیارہ تاریخ کو اس فاتحہ کا وہ ایسا اہتمام کرتے تھے کہ لوگوں کو تعجب ہوا کرتا تھا، فاتحہ کا برتن الگ تھا، پکانے کا برتن الگ تھا، اس سے متعلق ہر چیز الگ تھی، یہاں تک کہ گھر کی خواتین جو اسے پکاتی تھیں وہ غسل کر کے باوضو پکاتی تھیں، اس اہتمام کے ساتھ ہر ماہ وہ چالیس سال تک گیارہویں کرتے رہے۔

فاتحہ کے دوران جب ان پر زیادہ رقت طاری ہوتی تھی تو وہ یہ شعر پڑھتے تھے کہ:

غوث بابا ہیں، غوث مائی ہیں
غوث ہی سب میری کمائی ہیں

عشق ومحبت کا سلسلہ ان کی زندگی کی آخری سانس تک رہا، یہاں تک کہ غالباً ۱۹۵۲ء میں اسی مہینے (جمادی الاولی) میں ان کا انتقال ہوا جس مہینے ان کے پیر ومرشد حضرت سرکار آسی علیہ الرحمہ کا انتقال ہوا تھا۔

سوال: -آپ کتنے بھائی بہن ہیں؟

جواب: -میری سگی ماں سے ہم لوگ تین بھائی تھے اور دو بہنیں، بہن سب سے بڑی تھیں، ہاجرہ خاتون جو حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے عقد میں آئیں اور دوسری بہن نعمت النساء، جو مولانا قاری رضاء المصطفیٰ صاحب کی ساس ہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد میرے بڑے بھائی صاحب مولانا غلام آسی، اس کے بعد میں جب کہ تیسرے بھائی جو سب سے چھوٹے تھے انیس احمد ان کا انتقال بچپن میں ہی ہوگیا۔

سوال: -اپنے بڑے بھائی مولانا غلام آسی صاحب کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: -میرے بھائی صاحب کا نام فضل الرسول غلام آسی ہے، فضل الرسول ان کے استاذ گرامی محدث پاکستان علامہ سردار احمد خاں صاحب نے رکھا جب کہ اصل نام غلام آسی ہے، ہمارا بچپن ایک ساتھ تو کم ہی گزرا، جب وہ گورہٹی میں دادا کے پاس پڑھا کرتے تھے تو میں اس وقت گاؤں میں پرائمری میں تھا، پھر جب میں گورہٹی گیا تو وہ ہدایہ الخو تک پڑھ کر امروہہ مولانا غلام جیلانی گھوسوی صاحب سے پڑھنے چلے گئے، ان کے ساتھ مولانا

حافظ عبد الرؤف صاحب بھی پڑھا کرتے تھے، جب وہ امروہہ گئے تو میں والد ماجد کے ساتھ دھنباد چلا گیا، جب کبھی وہ تعطیل کے زمانے میں تشریف لاتے تھے تب ان سے ملاقات ہوتی تھی۔

سوال:۔آپ اپنی تعلیم کے بارے میں ذکر کررہے تھے؟

جواب:۔ہاں! جیسا کہ میں بتارہا تھا کہ گورہنی میں گلستاں بوستاں جب میں پڑھ رہا تھا اس وقت میری والدہ کا انتقال ہوگیا اور ہم سبھوں کو لے کر والد صاحب دھنباد چلے آئے اور میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا، والد صاحب بھی کمزور ہو گئے تو والد صاحب نے مجھے اپنے ساتھ اپنے کاروبار میں لگا دیا اور فرماتے تھے کہ میاں! اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور علم عطا فرمائے گا، اس وقت والد صاحب کی کتابوں کی دکان تھی تو میں کتابوں کی دکان پر بیٹھتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ہمارے علاقے کا ایک لڑکا مولانا غلام جیلانی صاحب سے پڑھنے کے لیے کانپور چلا گیا، کیونکہ مولانا امروہہ سے کانپور احسن المدارس چلے آئے تھے، وہ لڑکا جب وہاں سے پڑھ کر چھٹی میں آیا تو بڑے ٹھاٹ سے آیا، چشمہ لگائے ہوئے، شیروانی پہنے ہوئے، لوگ اس کی عزت کرتے، میں اسے دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہوگیا، میں سوچنے لگا کہ یہ پڑھنے گیا تھا اور جب پڑھ کر آیا تو کتنی شان سے رہتا ہے، لوگ اس کو اہمیت دیتے ہیں، اس کی عزت کرتے ہیں اور سب اس کو مولوی صاحب کہتے ہیں، اور مجھ کو کوئی بھی نہیں پوچھتا ہے، تو میرے دل میں ایک ٹھیس سی لگی۔ ایک دن اور ایسا ہوا کہ میں کتاب کی دکان لگا کر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص وہاں سے گزرا اور مجھ سے کہا کہ میاں! صرف کتاب بیچتے ہی رہو گے یا پڑھو گے بھی؟ یہ کہہ کر تو وہ چلا گیا لیکن میرے دل کو اس سے بھی بہت ٹھیس لگی، اس حادثے کے بعد میرا پڑھنے کا اضطراب اور بڑھ گیا، لیکن میں کروں تو کیا کروں، والد صاحب مجھے باہر بھیجنے کو تیار نہیں تھے، اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے بھاگ جانا چاہیے، اس ارادے کے ساتھ میں بھاگنے کی تیاری میں لگ گیا اور روزانہ کتاب کی دکان سے ایک پیسہ الگ نکال کر رکھ دیتا تھا تا کہ جب پڑھنے جاؤں گا تو یہ راستے کا خرچ ہوگا، خیر جب دو روپے جمع ہو گئے تو میں نے سوچا یہ تو بہت ہوگیا اور میں اپنے آپ کو راجا سمجھنے لگا اور اس دو روپے کو بار بار تنہائی میں بیٹھ کر گنتا تھا اور خوش ہوتا تھا، بہر کیف ایک

دن میں نے یہ عزم کرلیا کہ مجھے کل صبح کو یہاں سے جانا ہے، میں نے سن رکھا تھا کہ بھائی صاحب الہ آباد میں رہتے ہیں تو ایک لڑکے کو میں نے اور تیار کرلیا، ہم لوگوں نے سر شام ہی اپنا مختصر سامان جس میں میرے پاس ایک جوڑا پرانا کپڑا ایک لنگی اور ایک لوٹا تھا گھر کے باہر چھپر پر رکھ دیا، گرمی کا موسم تھا، لوگ آنگن میں سویا کرتے تھے، لیکن والد صاحب اندر سوتے تھے، پھر صبح ہونے سے قبل تقریباً چار بجے میں اٹھا، اپنا سامان لیا اور اس لڑکے کا گھر قریب ہی تھا، اس کو بھی لیا اور ہم لوگ پیدل اسٹیشن چل پڑے، وہاں سے ایک ٹرین صبح پانچ بجے چلتی تھی لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جاتی ہے، اس لیے ہم لوگوں نے یہ پروگرام بنایا کہ وہ جہاں تک جائے گی ہم بھی وہاں تک جائیں گے پھر کیسے بھی بھائی صاحب کے پاس الہ آباد پہنچنے کی کوشش کریں گے، ہم لوگ چھوٹے تھے اس لیے کسی نے بتادیا کہ عورتوں کے ڈبے میں بیٹھ جاؤ، وہاں چیک کرنے والا کوئی نہیں آتا ہے، لہٰذا ہم لوگ اپنی اپنی پوٹلی دبائے عورتوں کے ڈبے میں آکر بغیر ٹکٹ کے بیٹھ گئے، گاڑی پورے دن چلتی رہی پھر رات آخری اسٹیشن پر جاکر رکی، ہم لوگ باہر اترے اور ایک پیسے کی ''لائی'' خرید کر کھائے اور پیٹ بھرنے کے لیے خوب پانی پی لیا، پھر اسٹیشن پر بیٹھ گئے، کسی سے پوچھا کہ اب گاڑی کب آئے گی، اس نے بتایا کہ رات کے تین بجے پٹنہ جانے والی ایک گاڑی آئے گی، پھر ہم اس ٹرین پر بیٹھ گئے اس نے ہمیں پٹنہ لے جاکر چھوڑ دیا۔ پٹنہ میں اتر کر ہم نے پوچھا کہ اب گاڑی کب جائے گی۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ جو گاڑی کھڑی ہے یہ ابھی جارہی ہے، پھر ہم نے پوچھا کہ یہ کہاں جارہی ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ دہلی جارہی ہے، ہم اس پر بیٹھ گئے، ہم لوگوں کی کوئی منزل تو تھی نہیں اور نہ یہ معلوم تھا کہ کون سی گاڑی الہ آباد جائے گی، خیر ایک کے بعد ایک اسٹیشن گزرتا رہا جب گاڑی الہ آباد پہنچی تو اترنے والے لوگوں میں کھلبلی مچی، لوگ اپنا سامان ٹھیک کرنے لگے کہ الہ آباد آگیا، جیسے ہی کانوں میں الہ آباد آنے کی آواز پہنچی میں نے خوشی سے چلاکر کہا کہ ارے یہیں تو ہمارے بھائی صاحب رہتے ہیں، پھر ہم الہ آباد میں اتر گئے، لیکن ہمارے سامنے مسئلہ تھا کہ اسٹیشن سے باہر کیسے جائیں، ٹکٹ تو تھا نہیں۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ہم لوگوں کو پریشان دیکھ کر ایک آدمی ہمارے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ کیوں پریشان ہو؟ ہم لوگوں نے اس کو اپنی پریشانی بتائی، تو اس نے

ہم لوگوں سے ہمدردی جتائی اور کہا کہ ہمارے پیچھے پیچھے آؤ، پھر اس نے معلوم نہیں کس راستے سے ہم لوگوں کو باہر نکال دیا، باہر نکل کر ہم لوگوں نے مدرسہ سجانیہ کا نام پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ یہاں سے قریب ہی ہے۔ اس محلے کا نام سرائے گڑھی ہے، پتہ معلوم کرنے کے بعد پھر ہم نے اپنے حلیے پر نظر ڈالی تو نہایت بری حالت تھی، تو ہم نے وہیں ایک درخت کے نیچے اپنے کپڑے بدلے اور ہاتھ منہ دھوئے اور پھر پوچھتے پوچھتے سرائے گڑھی پہنچ گئے، پھر سرائے گڑھی میں کسی نے مدرسہ سجانیہ کا پتہ بتا دیا، ہم جیسے ہی مدرسہ سجانیہ میں داخل ہوئے تو وہاں سامنے ایک لڑکے کی پٹائی ہو رہی تھی، (ہنستے ہوئے) ہم لوگ دیکھ کر گھبرا گئے اور کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے، پھر بھائی صاحب کا پتہ پوچھا، اس وقت بھائی صاحب اور مفتی معین الدین جو اس وقت کچھوچھہ شریف میں ہیں پڑھ رہے تھے، خیر کچھ دیر میں جب بھائی صاحب کو پتہ چلا تو وہ آئے تو میں نے ان سے ساری روداد بیان کی اور بتایا کہ میں بابا کو بتائے بغیر بھاگ کر آیا ہوں، بھائی صاحب میرے اندر تعلیم کا شوق دیکھا تو خوش ہوئے اور کہا کہ تم نے اچھا کیا، پھر میرا وہاں داخلہ انہوں نے کروا دیا مگر جو میرے ساتھ لڑکا بھاگا تھا وہ دو چار دنوں میں گھبرا گیا اور رونے لگا پھر وہ واپس لوٹ گیا۔

مدرسہ سجانیہ میں ان دنوں عربی کی تعلیم بہت اچھی نہیں تھی جب کہ مبارکپور میں اشرفیہ نیا نیا قائم ہوا تھا اور حافظ ملت کے وہاں پہنچ جانے کے بعد دھیرے دھیرے اس کی شہرت پھیل رہی تھی، اس لیے میرے بھائی صاحب نے تین چار مہینوں کے بعد مجھے مبارکپور پہنچا دیا، مبارکپور میں اس زمانے میں میرے چچا زاد بھائی مولانا غلام محی الدین پڑھایا کرتے تھے اور یہ اجمیر شریف میں صدر الشریعہ کے تلامذہ میں سے تھے تو میرے بھائی صاحب نے مجھے انہی کے حوالے کر دیا، اس وقت مبارکپور میں طلبہ کی جاگیریں لگا کرتی تھیں جہاں وہ کھانا کھایا کرتے تھے، اتفاق سے میری کوئی جاگیر نہیں لگ پائی اور میں میزان نحو میر بھی پڑھنے کے لائق نہیں تھا اس لیے میرا وہاں داخلہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا تو مولانا غلام محی الدین صاحب روزانہ مجھے چار آنے کھانے کے لیے دیا کرتے تھے، اس زمانے میں ایک آنے کی چار روٹی اور ایک آنے کی دال ملتی تھی تو میں دو آنے صبح اور دو آنے میں رات کا کھانا کھایا کرتا تھا، پھر میں نے وہاں سے اپنے بابا کو خط لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ " اچھا ہوا تم

چلے گئے، اگر تم نہیں جاتے تو میں تو تمہیں بھیجنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، میرے پاس اتنا پیسہ ہی نہیں جمع ہوتا کہ میں تمہیں بھیجتا'' یہ ان کا پہلا اور آخری خط تھا، اس کے بعد جب تک ہم پڑھتے رہے ان کا کوئی خط کبھی نہیں آیا، وہ خط کبھی نہیں لکھتے تھے کیوں کہ وہ اپنے ہوش میں ہی نہیں رہتے تھے، پھر میں نے محنت شروع کی، اس زمانے میں امتحان وغیرہ کا سلسلہ تو اتنا تھا نہیں، اس لیے اپنی سخت محنتوں کی وجہ سے ایک سال سے قبل ہی دوسری جماعت میں چلا جاتا تھا، اس وقت وہاں حافظ عبدالرؤف صاحب اور مفتی ظفر علی نعمانی صاحب بھی پڑھا کرتے تھے تو میں ان لوگوں کی اور اساتذہ کی خدمت کر کے اور ان کی خوشامدیں کر کے پڑھا کرتا تھا، جس سال میں وہاں گیا وہ سال گزر گیا اور پھر دوسرے سال سے مبارکپور کا چندہ شروع ہوا جس کا ذکر میں نے پہلے کیا، میری تعلیمی محنت اور نظموں کی وجہ سے حافظ ملت مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے اور انہوں نے میری جاگیر کا انتظام فرمادیا۔ ایک وقت میں علی نگر میں عبدالستار صاحب کے یہاں اور ایک وقت نوادہ میں ایک شخص کے یہاں کھایا کرتا تھا۔

اس زمانے میں میری آواز بہت اچھی تھی تو میں میلادوں میں نعتیں پڑھنے لگا اور تقریریں بھی کرنے لگا تو علاقے میں مشہور ہو گیا، پھر ان علاقوں میں جہاں بھی میلاد ہوتا حافظ ملت کے ساتھ میں بھی جایا کرتا تھا، رفتہ رفتہ میری تقریریں اتنی اچھی ہونے لگیں کہ میں مبارکپور سے باہر بھی کبھی کبھی جانے لگا۔

سوال: آپ کو تحریر کا شوق کیسے پیدا ہوا؟

جواب: ایک مرتبہ جب چھٹی ہوئی تو میں گھر گیا، انہی دنوں محلے کی ایک مسجد جس میں میرے والد نماز پڑھایا کرتے تھے، وہاں ایک میلاد رکھا گیا، محلے والے میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اس میلاد کا اعلان لکھ دو، میں نے پوسٹر کی شکل میں جلسے کا اعلان لکھ دیا، چونکہ ان دنوں پریس اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا، چھاپہ خانہ کلکتہ میں تھا اور کچھ چھپوانے کے لیے وہاں جانا پڑتا تھا، اس اعلان کے لکھتے وقت میں نے دو رنگ کی روشنائی استعمال کی، سرخ اور سبز اور عبارت آرائی بھی خوب ڈھنگ سے کی تھی، اس پوسٹر کو محلے والوں نے مسجد میں منبر کے پاس دیوار پر چسپاں کر دیا، جب میرے والد صاحب نماز پڑھانے آئے تو ان کی اس پوسٹر پر نظر پڑی تو انہوں نے قریب جا کر اسے پڑھا، پوسٹر کی

خوشخطی اور خوبصورت عبارت پر وہ حیران رہ گئے۔ آخر یہاں ایسا لکھنے والا کون ہے؟! پھر انہوں نے کسی سے پوچھا کہ یہ پوسٹر کس نے لکھا ہے؟ تو کسی نے بتایا کہ آپ کے چھوٹے مولوی صاحب نے تو لکھا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے، وضو کر رہے تھے کہ میں وہاں پہنچ گیا، انہوں نے مجھ سے حیرت سے پوچھا کہ یہ تم نے لکھا ہے؟ میں نے کہا: ہاں!، انہوں نے پھر پوچھا کہ مضمون کس نے بنایا؟ میں نے کہا کہ ہم ہی نے بنایا ہے، یہ سن کر انہوں نے کہا واہ ماشاء اللہ اور پھر خوب دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں قلم کی طاقت اور اس کی خوبی عطا فرمائے، تقریباً وضو کرنے کے بعد تین چار منٹ تک وہ دعا فرماتے رہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت باب اجابت کھلا ہوا تھا اور میرے والد کی دعا قبول ہوگئی، مجھے اس کے بعد سے ہی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

سوال: آپ رشتۂ ازدواج میں کب منسلک ہوئے؟

جواب: آپ میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں کہ میں کہیں بھی کسی کام سے جاتا ہوں تو میری یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہاں کوئی دینی، مذہبی اور ملی کام ہو، کوئی مدرسہ قائم ہو، کوئی تعلیمی ادارہ قائم ہو، کوئی مسجد بنے اور کوئی فلاحی کام ہو۔ یہ مزاج کوئی نیا نہیں ہے بلکہ ابتدا سے ہی میرا یہی مزاج رہا، تو ایک مرتبہ جب میں حافظ ملت کے ساتھ جامعہ عربیہ ناگپور گیا، وہاں ایک علاقہ ہے مومن پورہ، وہاں بڑی تعداد میں انصاری برادری کے لوگ رہتے ہیں، تو وہ لوگ بانی جامعہ عربیہ مفتی عبدالرشید صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت ہم لوگ شبینہ یعنی رات کا ایک مدرسہ کھولنا چاہتے ہیں، آپ ہمیں کوئی مولوی صاحب دے دیں تاکہ وہ بچوں کو رات میں دو تین گھنٹہ پڑھا سکیں، تو انہوں نے مجھے وہاں کے لیے مقرر کر دیا اور میں وہاں گیا، جب میں وہاں گیا تو میں نے اس کا نقشہ ہی بدل دیا، میرے طریقۂ تعلیم کے بارے میں سن کر دھیرے دھیرے وہاں بہت لڑکے آگئے، پھر میں نے وہاں تعلیم کے علاوہ مشقی جلسے، مکالمے اور دیگر خارجی سرگرمیاں شروع کر دیں، طلبہ کو میں تقریریں لکھ دیتا تھا اور ان پر سخت پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ میری درسگاہ میں آنے کے بعد صرف عربی میں ہی گفتگو کریں گے، اس کے لیے میں نے انہیں عربی کے جملے لکھ کر دیئے کہ کسی کو اگر پانی پینے کی وجہ سے چھٹی مانگنی ہو تو وہ کیسے بولے گا اور کسی کو استنجا کے لیے

چھٹی مانگی ہو تو وہ یہ بولے گا وغیرہ، یہاں تک کہ ایک مرتبہ محدث اعظم ہند ناگپور تشریف لائے تو میں نے انہیں معائنے کے لیے دعوت دی، وہ تشریف لائے، میں نے پہلے سے ہی بعض طلبہ کو عربی میں "دعوت تعلیم" کے موضوع پر تقریر کی تیاری کروا رکھی تھی جن میں سے بعض کی زبان اتنی شستہ تھی کہ حیرت ہوتی تھی، جب میں طلبہ کو اس موضوع پر تقریر کی تیاری کرانے کی سوچ رہا تھا تو حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی ایک کتاب 'علمائے سلف' میرے ہاتھ لگی جس میں محدثین کے سوانحی خاکے تھے، مثلاً اس میں ایک باب نابینا محدثین کی زندگی پر تھا کہ انہوں نے آنکھوں کی روشنی نہ ہونے کے باوجود کس طرح علم حدیث حاصل کیا، ایک باب ایسے محدثین کا تھا جنہوں نے ہزاروں ہزار میل پیدل سفر کر کے علم حدیث حاصل کیا، اس میں ایک باب ایسے محدثین کا تھا جنہوں نے علم حدیث حاصل کرنے کے لیے اپنے گھروں کا ساز و سامان بیچ دیا، تو ہر باب پر میں نے عربی میں ایک تقریر تیار کروائی، اس کے بعد جب محدث اعظم کے سامنے لڑکوں نے تقریر کی تو وہ حیران نگاہوں سے دیکھتے رہ گئے اور حد درجہ متاثر ہوئے اور پھر حضرت نے تقریر فرمائی اور بہت حوصلہ افزائی فرمائی۔ بہر کیف! حافظ ملت تقریباً ایک سال تک ناگپور میں رہے، ادھر ان کے نہ ہونے کی وجہ سے مبارک پور میں ہاہاکار مچ گئی، لوگ صدر الشریعہ کے پاس آئے اور خوب روئے گڑگڑائے کہ حضور ہم لوگوں سے غلطی ہوگئی ہمیں معاف کر دیجئے اور انہیں دوبارہ بھیج دیجئے، خیر پھر حافظ ملت دوبارہ تشریف لائے اور پھر میں بھی ان کے ساتھ مبارکپور چلا آیا۔ میں جس وقت حضرت کے ساتھ واپس آیا وہ میری فضیلت کا سال تھا یعنی تعلیم کا آخری سال تھا، لیکن میں نے ناگپور میں جس طرح طلبہ پر محنت کی تھی اس نے وہاں کے لوگوں پر گہرا نقش چھوڑا تھا، چنانچہ اس کی وجہ سے ناگپور سے کئی لوگ مبارکپور آئے اور حافظ ملت کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے بعد ان سے کہا کہ حضرت جب یہ مولانا فارغ ہو جائیں تو انہیں ناگپور بھیج دیجیے، گویا میرے تعلیمی زمانے میں ہی میرا appointment ہو گیا، خیر جب ان لوگوں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو حافظ ملت راضی ہو گئے اور انہوں نے مجھے وہاں بھیج دیا، میں وہاں گیا تو مجھ سے پڑھنے کے لیے بہت سے طلبہ کے ساتھ ساتھ مولانا صفی اللہ بناری اور مفتی جلال الدین احمد امجدی وغیرہ بھی آ گئے۔

مفتی جلال الدین امجدی اس وقت مومن پورہ ہی میں رہتے تھے اور کپڑا بننے کا کام کرتے تھے، تو وہ دن میں تو کام کرتے تھے لیکن رات میں شبینہ مدرسے میں میری درس میں آتے اور پڑھا کرتے تھے، یہ شبینہ مدرسے کی ہی تعلیم کا اثر تھا کہ وہ اتنے بڑے مولانا ہو گئے۔

سوال: مفتی جلال الدین امجدی صاحب (علیہ الرحمہ) نے کہاں تک آپ سے پڑھا؟

جواب: انہوں نے بخاری شریف تک مجھ ہی سے پڑھا اور مولانا صفی اللہ نے بھی بخاری تک پڑھا۔

خیر بات بہت آگے نکل گئی، آپ نے میری شادی کے متعلق سوال کیا تھا، میں ناگپور میں ہی تدریسی خدمت انجام دے رہا تھا کہ میری ہمشیرہ (اہلیہ صدر الشریعہ) نے میری شادی کے لیے سلسلہ جنبانی کی اور پھر میرے خالہ زاد بھائی عبدالوہاب صاحب کی بچی کے ساتھ میرا رشتہ طے کیا، اس لیے میری شادی کے تمام امور قادری منزل گھوسی سے انجام پائے، یہاں تک کہ بارات بھی قادری منزل گھوسی سے ہی نکلی، اس شادی میں حضرت صدر الشریعہ، حافظ ملت، مولانا عبدالمصطفی ازہری، حافظ عبدالرؤف، مولانا غلام یزدانی، مولانا شمس الحق اور بھی بہت سے علما شریک تھے۔ اس موقع پر پگڑی بندھائی کی رسم ہوئی، یہ رسم بہنوئی انجام دیتا ہے اور میرے بہنوئی حضرت صدر الشریعہ تھے، تو انہوں نے ہی پگڑی باندھی، لیکن پگڑی بندھائی میں جو پیسے دیئے جاتے ہیں وہ دینے کے لیے میرے پاس نہیں تھا اور میری شادی میں نہ میرے بھائی صاحب آسکے اور نہ میرے والد، تو سارے فرائض میری ہمشیرہ محترمہ نے انجام دیئے، انہوں نے پگڑی بندھائی کے لیے پہلے ہی سے سو روپے کا نوٹ مجھے دے دیا تھا، جب صدر الشریعہ نے مجھے پگڑی باندھی تو کہا کہ نرا نکوا لاؤ، (میرا حق لاؤ) میں جھٹ جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور پیش کر دیا، وہاں لوگوں نے زور کا قہقہہ لگایا اور حضرت نے اس نوٹ کو رکھ لیا۔ بارات نکلی اور ہم لوگ گھوسی کے قریب اندارا اسٹیشن پر بلیا جانے والی ٹرین پر بیٹھنے کے لیے پہونچے، اس بارات میں صدر الشریعہ اور حافظ ملت سمیت تقریباً ۲۰ افراد تھے، ہم لوگ اندارا اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں بیٹھے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے، اس وقت صدر الشریعہ کی زبان پر یہ شعر جاری تھا کہ

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم

جنید و شبلی و عطار ہم مست

اس کے بعد گاڑی آئی ہم لوگ بیٹھ گئے اور چل گھر ایک جگہ ہے وہاں اتر گئے، چل گھر سے ان لوگوں نے صدر الشریعہ کو لے جانے کے لیے ڈولی کا انتظام کیا تھا جبکہ ہم لوگوں کے لیے بیل گاڑی کا نظم تھا، بارات میں مولانا سید مجتبی اشرف کچھوچھوی بھی تھے جو کافی لمبے تھے اور مولانا علی احمد بھی تھے جو کافی موٹے تھے تو از راہ مذاق لوگ مجتبی صاحب کو اونٹ اور علی احمد کو ہاتھی کہتے تھے، بیل گاڑی سے چلتے ہوئے راستے میں نیم کا درخت آیا اور نیم کا پتہ اونٹ بڑے رغبت سے کھاتا ہے تو مولوی علی احمد نے نیم کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مجتبی میاں! ناشتہ کرلو، ہم لوگ خوب ہنسے اور محظوظ ہوتے ہوئے چلتے رہے، اچانک راستے میں پیپل کا درخت آیا، جس کو ہاتھی بڑے شوق سے کھاتا ہے، درخت دیکھتے ہی مولوی مجتبی نے کہا مولوی علی احمد آ گیا کھانا کھالو، لوگ بے تحاشہ ہنسنے لگے، اس طرح سے راستہ طے ہوئے، اس وقت بلیار تھو میں پہلی مرتبہ ان لوگوں نے مائک کا انتظام کروایا تھا، مائک پر ایک صاحب نے سہرا پڑھنا شروع کیا تو علاقے کے تمام لوگ آواز کو سُنکر گھروں سے باہر نکل آئے کہ آخر یہ کیا چیز آ گئی؟ وہاں کی زبان میں وہ سب کہنے لگے (قہقہہ لگاتے ہوئے) اتنا بھاری کیکر آواز با بھائی، یہ مسینیا ما سے آواج آوتا بھائی، (اتنی بھاری کس کی آواز ہے بھائی، یہ تو مشین میں سے آواز آرہی ہے) لوگوں کی بھیڑ لگ گئی، نکاح صدر الشریعہ نے پڑھایا اور جب صبح کو بارات رخصت ہونے لگی تو میرے بابا (والد ماجد) پہنچے، کیونکہ اس وقت آنے جانے کے لیے ایک دو ٹرین اور بسیں ہوتی تھیں اور ان کی پہلی بس چھوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ وقت پر نہیں آسکے تھے۔

(حضرت علامہ ارشد القادری کی دو شادیاں ہوئی تھیں، دوسری شادی مولانا قاری حکیم شفیق احمد صاحب جو ڈونگر گڑھ صوبہ مدھیہ پردیش کے رہنے والے تھے ان کی صاحبزادی محترمہ عائشہ قادری علیہا الرحمہ سے ہوئی، پہلی زوجہ سے حضرت علامہ کو کوئی اولاد نہیں تھی جبکہ مؤخر الذکر سے پانچ صاحبزادے جناب غلام ربانی، جناب فیض ربانی، جناب غلام جیلانی، ڈاکٹر غلام زرقانی اور غلام شعرانی ہوئے اور دو صاحبزادیاں سیما آسی اور زیبا

قادری ہوئیں۔ موصوفہ نہایت نیک طینت، پاکباز اور صابرہ تھیں، انہوں نے نہایت تنگدستی میں نہ صرف زندگی گزاری بلکہ تمام بچوں کی اچھی تربیت اور تعلیم کا بھی خیال رکھا اور کبھی اس فقر و فاقہ کا شکوہ نہیں کیا، حضرت علامہ کی سیماب صفت شخصیت جو قوم و ملت کی ترقی، خوشحالی اور کامیابی کے لیے زندگی کی آخری سانس تک تڑپتی رہی اور اس فکر میں کبھی اپنے بچوں اور گھر کی بھی پرواہ نہیں کی لیکن انہوں نے کبھی اس پر اُف تک نہ کیا اور نہ کبھی حضرت علامہ کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں میں رخنہ ڈالا، بقول حضرت علامہ "اگر انہوں نے مجھے گھریلو زندگی سے بے نیاز نہ کیا ہوتا تو شاید میں عالمی سطح پر اپنی قوم اور ملت کے لیے اتنا کچھ نہ کر پاتا" اس حیثیت سے اگر ہم موصوفہ کی حیات کا جائزہ لیں تو حضرت علامہ کے لافانی کارناموں میں وہ برابر کی حصے دار ہیں، ان کی اس نیک بختی کے طفیل ان کا انتقال ۱۹۸۹ء میں رمضان المبارک کی ۲۶ تاریخ کو ہوا، جب کہ تدفین ۲۷ویں کی شب بروز پیر کو جمشید پور میں عمل میں آئی جو شب قدر بھی کہلاتی ہے۔ ح۔ نورانی)

سوال: آپ کے مضامین کن رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے، اگر ہوتے تھے تو یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا؟

جواب: ۱۹۴۴ء میں میری فراغت ہوئی تھی، فراغت سے پہلے ہی میں باقاعدہ مذہبی جلسوں میں بھی جانے لگا اور مضامین بھی باقاعدگی سے لکھنے لگا جو ہفت روزہ الفقیہ امرتسر میں شائع ہوتے تھے، اس دور میں مباحثے بھی خوب ہوتے تھے، عموماً ان مباحثوں کا موضوع آزادی ہند اور قیام پاکستان ہوا کرتا تھا، طلبہ کا ایک طبقہ قیام پاکستان کا مؤید تھا جبکہ دوسرا طبقہ مخالف۔

سوال: آپ کی جماعت میں کتنے ساتھی تھے اور کیسے تھے؟

جواب: میری جماعت میں غالباً آٹھ یا دس طلبہ ہوں گے، ان میں زیادہ تر متوسط درجے کے تھے، مجھے اپنے تعلق سے آج بھی یاد ہے کہ جب میں حافظ ملت کی درسگاہ میں لہجے کے ساتھ بخاری شریف کی عبارت پڑھتا تھا تو ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی، یاد آتا ہے کہ ایک بار میں نے حدیث ابن رعنہ اور حدیث افک پڑھی تو وہ رونے لگے اور فرمایا کہ "تمہاری عبارت خوانی پر دل کرتا ہے کہ تمہارا منہ چوم لوں"۔

سوال: اس دور کے مبارکپور کے کچھ واقعات ہمیں بھی سنائیں جب وہ زمین حضرت اشرفی میاں اور صدر الشریعہ کے قدم چومتی تھی اور جواں سال حافظ ملت کا آفتاب علم وفضل اپنے نصف النہار پر تھا؟

جواب: جب حافظ ملت پہلی بار مبارکپور تشریف لائے تو جو پرانا مدرسہ تھا اسی میں قیام کیا، اس وقت وہ مصباح العلوم کے نام سے تھا اور تعلیمی معیار اونچا نہیں تھا، لیکن حافظ ملت کے پہنچنے کے بعد جب ان کے علم وفضل کا شہرہ دور دور تک ہونے لگا تو طلبہ کی ایک بڑی تعداد وہاں آنے لگی، اس زمانے میں حافظ ملت ۲۶ر کتابیں ہدایۃ النحو سے لیکر شمس بازغہ، شرح چغمنی اور صدرہ تک پڑھاتے تھے اور کچھ کتابیں رہ جاتی تھیں، تو عصر کے بعد پڑھاتے تھے، کیوں کہ اس وقت اساتذہ کی قلت تھی اور انہیں طلبہ کی تعلیم وتربیت کا ایک جنون تھا، طلبہ کی تعلیم وتربیت کے علاوہ مبارکپور میں ان کی تقریریں بھی ہونے لگیں، ان کی تقریریں نہایت ایمان افروز اور دل ہلا دینے والی ہوا کرتی تھیں، چند لفظوں میں کسی بات کو بھی ذہن میں نقش کرانا ان کا کمال تھا، ان تمام سرگرمیوں کو دیکھ کر لوگ محسوس کرنے لگے کہ اب یہاں کچھ اہم کام ضرور ہوں گے۔ اس دور میں ایک دیوبندی مولوی شکر اللہ نے بھی وہاں ادارہ کھول رکھا تھا، حافظ ملت کی محنت اور ان کی مقبولیت دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ اگر یونہی سلسلہ چلتا رہا تو ہماری تعداد کم ہوتی چلی جائے گی، کیوں کہ اکثریت انہی کی تھی اور اس سے پہلے کوئی قابل قدر سنی عالم وہاں تھا نہیں، مولوی صدیق صاحب گھوسی کے تھے مگر وہ بہت خاموش آدمی تھے، اور صرف درس وتدریس کے آدمی تھے، جبکہ حافظ ملت درس وتدریس کے علاوہ میدان کے بھی آدمی تھے، خیر! تو اس وقت پہلی بار مولوی شکر اللہ نے حافظ ملت کے زور کو ختم کرنے کے لیے جوابی جلسہ بڑے اہتمام سے کیا اور بہت سے دیوبندی علما کو بلوایا اور اس جلسے میں اس نے ہم لوگوں کو کہا کہ یہ لوگ 'رضاخانی' ہیں اور پھر تردید کی، اس حملے کے بعد حافظ ملت کی قیادت میں مبارک پور میں بہار آگئی، اور دوسرے ہی دن حافظ ملت نے جوابی جلسہ کیا گولا بازار میں، اس میں حضرت نے ایسی تقریر فرمائی کہ لوگوں میں ایک انقلابی لہر دوڑ گئی اور ان کی تقریروں کی دھجی اڑا کر رکھ دی، پھر وہاں کے دیوبندی عوام نے مولوی شکر اللہ پر دباؤ ڈالا کہ اب آپ جواب دو، جس کی وجہ سے ان کو بھی

جوابی جلسہ کرنا پڑا۔اس کے بعد حافظ ملت نے اس سے بڑے جلسے کا انعقاد کیا، حافظ ملت کی تحریک اور ان کی موثر تقریر کی وجہ سے ہمارے جلسوں میں لوگوں کا ہجوم عظیم ہوتا تھا۔اس وقت مبارکپور میں گویا شام کا یہ مشغلہ ہوگیا کہ ایک دن ان کا جلسہ پھر ایک دن ہمارا جوابی جلسہ، پہلے پہل تو ان کے جلسوں میں لوگ زیادہ ہوا کرتے تھے کیونکہ مبارکپور میں ان ہی کی کثرت تھی مگر آہستہ آہستہ لوگ ان سے کٹنے لگے اور اہل سنت کے جلسوں میں مجمع کی تعداد بڑھنے لگی، یہاں تک کہ چھ مہینے تک اس طرح کا سلسلہ رہا اور پھر ان کا عالم یہ ہوا کہ ان کے جلسوں میں دو سو یا ڈھائی سو آدمی رہ گئے اور ادھر کبھی دس ہزار، کبھی بارہ ہزار، پندرہ ہزار کا مجمع ہوا کرتا، پھر ایک جلسے میں مولوی شکر اللہ نے اعلان کر دیا کہ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا،اب میں کل سے کوئی جلسہ نہیں کرونگا،اس کے بعد یہ مقابلہ آرائی ختم ہوگئی،لیکن حافظ ملت کے کچھ بڑے تلامذہ جیسے مولوی عباس اور مولوی عثمان وغیرہ مولوی شکر اللہ کے گھر پہنچ گئے کچھ ثبوت طلب کرنے کے لیے جو باتیں اس نے جلسے میں کہی تھیں،تو اس نے دروازہ نہیں کھولا اور لوگوں نے ان لوگوں کو واپس کر دیا۔

اس کامیابی کے بعد طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی اور جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور نئی عمارتوں کی بھی ضرورت محسوس ہوئی تو پھر گولا بازار کے پیچھے جہاں اس وقت اشرفی روڈ پر دو منزلہ عمارت ہے، وہاں زمین حاصل کی گئی اور اس کے سنگ بنیاد کے لیے حضرت اشرفی میاں رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے، کیونکہ مبارکپور کے زیادہ تر افراد کچھوچھہ شریف سے ہی منسلک تھے اس میں محدث اعظم ہند اور صدر الشریعہ بھی تشریف لائے، وہاں پر ایک بڑا جلسہ ہوا اور پھر جلسے کے بعد سنگ بنیاد رکھا گیا۔ جب وہاں عظیم الشان عمارت بن گئی تو دیوبندیوں کو سخت تکلیف ہوئی اور افسوس بھی کہ اگر ہم نے ان کو چھیڑا نہ ہوتا تو یہ سب مصباح العلوم ہی میں رہتے،اس پریشانی سے نپٹنے کے لیے ان لوگوں نے منظور نعمانی کو بلوایا،اس وقت محدث اعظم ہند بھی گولا بازار کے ایک جلسے میں تشریف لائے ہوئے تھے، رات میں جلسہ ہو ہی رہا تھا کہ اپنی علمی شوکت اور حقانیت کا ڈھونگ رچانے کے لیے عین جلسے کے وقت جلسہ گاہ میں وہ لوگ منظور نعمانی کو لیکر پہونچ گئے اور اپنی کرسیاں بچھادیں، اس وقت محدث اعظم تقریر فرما رہے تھے، یہ دیکھ کر حضرت نے اپنی تقریر روک دی اور فرمایا

کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ مجھے یاد آتا ہے کہ اس نے کہا کہ "آپ کے اعلیٰ حضرت نے ہمارے بزرگوں کی تکفیر کی ہے، اس پر میں آپ سے کلام کرنا چاہتا ہوں اور مناظرہ کرنا چاہتا ہوں"۔ تو حضرت محدث اعظم ہند نے فرمایا کہ "یہ جو کچھ بھی ابھی آپ نے فرمایا از راہ کرم اسے قلم بند کر کے اور اس کے نیچے دستخط کر کے ہمارے حوالے کر دیں پھر اس کے بعد ہم آپ کی ہر بات سنیں گے۔" اس نے کہا کہ "تحریر کی کیا ضرورت ہے، آپ کو بات کرنی ہے تو بات کیجئے" تو حضرت نے فرمایا کہ اور تحریر ہم کس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں، بات ہی کرنے کے لیے تو تحریر حاصل کرنا چاہتے ہیں، موضوع تو آپ نے متعین کر دیا ہے، اب جس طرح مناظرہ ہوتا ہے اس طرح آپ کریں، اس میں پہلے شرطیں قلم بند ہوتی ہیں، مناظر اور مناظرہ گاہ کا تعین ہوتا ہے، اس وقت آپ خالی ہاتھ آئے ہیں، آپ کے پاس کتابیں بھی نہیں ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس وقت مناظرہ کی نیت سے نہیں آئے ہیں بلکہ ہنگامہ اور انتشار پیدا کرنے کے لیے آئے ہیں، لیکن اس نے لکھ کر نہیں دیا اور پھر چلا گیا، جس سے ان کی اور بھی بات خراب ہوگئی، ان کے عوام کہنے لگے کہ "جب انہیں لکھ کر دینا ہی نہیں تھا تو یہ ان کے جلسے میں کیوں گئے"؟ بہر کیف مبارک پور کو اہل سنت و جماعت کا قصبہ بنانے میں حافظ ملت نے جو قربانیاں دی ہیں اور ان کے علم و فضل کا جو سکہ وہاں چلا ہے، اس کے اثرات آج ہم پوری دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔

سوال: آپ کے دور طالب علمی میں خاص طور پر کس بزرگ کا مبارکپور میں اثر تھا، کن سے عقیدت تھی اور کون زیادہ تشریف لاتے تھے؟

جواب: عہد قدیم سے مبارکپور، جون پور، بلیا، اعظم گڑھ، سلطان پور، اور آس پاس کے جو اضلاع ہیں وہاں کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز عقیدت کچھوچھہ شریف رہا ہے، عرس مبارک کے زمانے میں مبارکپور سے بھی بڑی تعداد میں مسلمان وہاں جاتے تھے اور سادات کچھوچھہ سے یہ منسلک تھے، ان پر انہیں کا اثر تھا۔ حافظ ملت اور صدر الشریعہ جب وہاں تشریف لائے تب ہی اہل مبارکپور بریلی اور اعلیٰ حضرت سے اچھی طرح واقف ہوئے۔

سوال: کیا حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمہ سے ان کا زیادہ تعلق تھا اور ان سے وہاں کے لوگ زیادہ عقیدت و محبت کا اظہار کرتے تھے؟

جواب: حضرت اشرفی میاں کواللہ تعالیٰ نے جوظاہری حسن و جمال اور جاہ وجلال عطا فرمایا تھا جس کی وجہ سے حضرت کوشبیہ غوث اعظم کہا جاتا تھا، ان کے چہرۂ پرنور کی زیارت سے دل پر اتنا گہرا اثر پڑتا تھا کہ اندر سے ضمیر چیخ اٹھتا تھا کہ یہ اللہ کا سچا ولی ہے۔ تقریر تو وہ زیادہ نہیں فرماتے تھے لیکن ان کی خموشی ان کی بزرگی کی کھلی ہوئی نشانی تھی، ان کا چہرہ اور ان کے لباس سے نورانیت اور نفاست جھلکتی تھی، تو مبارکپور کے لوگ ان سے بہت زیادہ متاثر تھے اور ان کے بڑے عقیدت مند تھے، وہ اعلیٰ حضرت سے بڑی محبت فرماتے تھے اور اعلیٰ حضرت کو ان سے بہت عقیدت تھی، چنانچہ یہ واقعہ آپ کے علم میں ہوگا کہ اعلیٰ حضرت کا وصال ہوا تو حضرت اپنی خانقاہ کچھوچھہ شریف میں تھے، اس وقت انہوں نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھائی، آسمان کی طرف دیر تک دیکھتے رہے اور پھر ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ رونے لگے، تو وہاں بیٹھے لوگوں کو حیرت ہوئی کہ حضرت آسمان کی طرف دیکھ کر گریہ کیوں فرما رہے ہیں؟ بہت دیر تک حضرت روتے رہے اور پھر جب آنکھوں کا تلاطم تھما تو لوگوں نے پوچھا کہ حضرت کیا بات ہے؟ فرمایا کہ ''میں نے دیکھا کہ قطب الارشاد کا جنازہ جا رہا ہے'' اس کے بعد وہاں اعلیٰ حضرت کے وصال کی خبر بذریعہ تار پہنچی۔

سوال: حضرت آپ کے اساتذہ اور مربیوں میں سے کس نے آپ پر گہرے نقوش چھوڑے؟

جواب: ہمارے زمانے میں وہاں متعدد اساتذہ تھے حضرت مولانا محمد سلیمان اشرفی بھاگلپوری صاحب، مولانا ثناء اللہ اعظمی صاحب، مولانا غلام محی الدین بلیاوی صاحب، مولانا عبدالمصطفی ازہری، مولانا شمس الحق صاحب، مولانا عبدالرؤف بلیاوی صاحب اور بھی چند اساتذہ تھے جن کے نام مجھے یاد نہیں آ رہے ہیں۔ ان میں سے مجھ پر جن کی زندگی کا سب سے گہرا نقش ہے وہ حافظ ملت ہی کی ذات ہے اور اس کے بعد مولانا محمد سلیمان صاحب، چونکہ دوسرے اساتذہ طلبہ کی تربیت سازی میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے، انہوں نے سبق پڑھا دیا اور بس، جبکہ حافظ ملت کا عالم یہ تھا کہ ان کو طلبہ کی نجی اور خاندانی زندگی سے بھی واقفیت ہوتی تھی اور وہ ان کی پریشانیوں کا حل بھی تلاش کرتے تھے، کوئی طالب علم غریب ہے اور اس قابل نہیں

منزل آگئی کہ وہ اپنی اقتصادی مشکلات کی وجہ تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا چاہتا ہے تو حافظ ملت اس کے لیے ایسی کوئی سبیل پیدا فرماتے تھے کہ اس کا تعلیمی سلسلہ جاری رہے، حافظ ملت نے خود میرے ساتھ جو کیا وہ لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ میرے والد نے مجھے میرے پورے دور طالب علمی میں کبھی پانچ روپے بھی نہیں بھیجا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی زندگی میں کبھی اتنے روپے جمع ہی نہیں ہوئے کہ وہ مجھے بھیجتے، کچھ پاس آئے وہ خرچ ہو گئے، اب ان حالات میں میرا جو عہد طالب علمی گزرا، اس میں حافظ ملت نے ہماری بہت بڑی مدد کی، میری اقتصادی مشکلات پر قابو پانے کے لیے وہ مجھے اپنے ساتھ جلسوں میں تشریف لے جاتے تھے، کبھی کبھی مجھے اکیلے بھیج دیتے تھے۔

میرے زمانہ مبارکپور میں رمضان شریف کے مہینے میں جو لوگ چندہ کیا کرتے تھے انہیں سفر کے اخراجات اور خورد ونوش کے علاوہ محنتانہ بھی ملا کرتا تھا، اس طرح سے یہ آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا، ایک مرتبہ حافظ ملت رمضان شریف میں مجھے اپنے ساتھ بھوجپور لے گئے، وہاں کپڑے کے جو تاجر تھے ان سے میرا تعارف کرایا اور مجھ سے اشرفیہ کا چندہ کروایا، چندے کی اس مہم میں میرے ساتھ وہ بھی تھے لیکن رسید میرے ہاتھ سے کٹوائی تاکہ اس کا محنتانہ مجھے ملے، چنانچہ میرے پاس اتنے پیسے ہو گئے کہ میں نے اپنے والد صاحب کے پاس بھی کچھ پیسے بھیج دیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت اپنے تلامذہ کو صرف پڑھاتے ہی نہیں تھے بلکہ فراغت کے بعد ان کو ملازمت سے بھی لگاتے، جو جس کام کے قابل ہوتا اسے وہاں لگا دیتے، اس کی تنخواہ بھی طے فرماتے، اس کے لیے تمام سہولتیں فراہم کرواتے تھے، کبھی وہاں کے منتظمین اور اس میں ناچاقی ہو گئی تو اس کا تصفیہ بھی فرماتے تھے، یہاں تک کہ بعض تلامذہ کی شادیاں بھی طے کرواتے تھے اور ان کی شادیوں میں شریک بھی ہوتے تھے، پھر ان کی نجی زندگی میں جو مشکلات آتی تھیں ان میں بھی مدد فرماتے تھے، یہی وجہ تھی کہ حافظ ملت کے سارے تلامذہ ان کو اپنا استاذ ہی نہیں مانتے تھے بلکہ اپنی زندگی کا مربی اور باپ سے زیادہ شفیق مانتے تھے، مگر حضرت کی یہ تمام کرم فرمائی صرف ان ہی لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی جن سے انہیں یہ توقع ہوتی تھی کہ یہ آگے چل کر دین کی خدمت کریں

تھے کہ یہ مستقبل میں کیا بنے گا اور پھر اس کی سرشت کے مطابق اس کی تربیت فرماتے تھے۔

سوال:- دوران تعلیم آپ کو کس فن سے دلچسپی تھی؟

جواب:- دوران تعلیم مجھے حدیث اور فقہ سے دلچسپی تھی اور تھوڑی سی منطق سے بھی۔

سوال:- علم مناظرہ سے؟

جواب:- علم مناظرہ سے میری کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، ویسے بھی اس فن کے لیے ہمارے پاس صرف ایک ہی کتاب ہے ''مناظرۂ رشیدیہ'' جس میں صرف مناظرے کے اصول اور ضوابط بتائے گئے ہیں کہ کس طرح سے گفتگو کرنی چاہیے، مدعی کے ذمے کیا ہے، مدعیٰ علیہ کے ذمے کیا ہے؟ دلیل انی، لمی اور برہانی کیا ہے، اب ان ضوابط کے ساتھ مناظرہ کرنے والا بھی کوئی نہیں رہا، اس لیے یہ فن اب کتاب ہی کے اندر رہ گیا۔ مجھے ویسے سب سے زیادہ جس فن سے دلچسپی تھی وہ ''رد وہابیہ'' تھا، مگر اس فن پر ہمارے یہاں کوئی کتاب تو ہے نہیں، اس لیے ہم نے اعلیٰ حضرت کی تصنیفات کا کثرت سے مطالعہ کیا۔

سوال:- اپنے دور طالب علمی میں مستقبل میں کچھ کرنے کے لیے آپ کے کچھ منصوبے اور عزائم تھے؟

جواب:- ہمارا جو دور طالب علمی گزرا ہے، اس میں ہم لوگ باہر کی دنیا سے بہت زیادہ باخبر نہیں تھے، اس لیے ہمارے سامنے بڑے عزائم اور منصوبے بھی نہیں تھے، بس ہم لوگ یہ دیکھا کرتے تھے کہ تقریر کرنے کے لیے باہر سے جو علمائے کرام تشریف لاتے ہیں، ان کی بڑی عزت اور مان جان ہوتی ہے، ان کا شاندار استقبال ہوتا ہے اور لوگوں کو ان سے بڑی عقیدت ہوتی ہے جس کا وہ اظہار کرتے ہیں تو دل میں یہ خیال گزرتا تھا اور یہ خواہش انگڑائی لیتی تھی کہ ہم بھی انہی کی طرح مقرر بنیں گے، اس لیے جمعرات کو جو مشقی بزم ہوتی تھی اس میں ہم بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور تقریر کے لیے نئے نئے عناوین سوچتے تھے، جنہیں سن کر لوگ داد بھی دیتے تھے۔

سوال:- اس زمانے میں مشقی بزم کہاں ہوا کرتی تھی؟

جواب:- طلبہ کی کثرت کی وجہ سے کئی حلقے بن جاتے تھے اور اشرفیہ کی دوسری

منزل بن جانے کے بعد بزم ہال کمرے میں ہوا کرتی تھی اور جب تک دوسری منزل نہیں بنی تھی تو متعدد کمروں میں ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں طلبہ کی انجمن کی طرف سے عید میلاد النبی کا جلوس بھی نکالا جاتا تھا، اس جلوس کو کامیاب بنانے کے لیے طلبہ کے درمیان کام تقسیم کیے جاتے تھے، اس میں مجھے بھی کوئی اہم ذمہ داری دی جاتی تھی، تو ہم لوگ مبارکپور کی اس سڑک کو جو اشرفی روڈ کہلاتی ہے دلہن کی طرح سجا دیتے تھے، اس وقت گولا بازار میں عید میلاد النبی کا جلسہ ہوا کرتا تھا تو اس کو بھی ہم لوگ سجاتے تھے اور مبارکپور میں جلوس کے ساتھ نظم پڑھنے والوں کی جو جماعت چلتی تھی ان کے ساتھ مبارکپور کا جو میلاد خواں طبقہ تھا وہ بھی ساتھ ساتھ رہتا تھا، مبارکپور میں اس دور میں بھی اور غالبًا آج بھی یہ رسم ہے کہ جب جلوس محلے سے گزرتا ہے تو بہت سے لوگ یہ خواہش کرتے ہیں کہ جلوس دو منٹ کے لیے ہمارے دروازے پر رک جائے اور حضور کی نعت شریف ہمیں پڑھ کر سنائی جائے، اس میں انجمن والوں کا بھی فائدہ ہوتا ہے کہ جب ان کے دروازے پر نظمیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ جوش میں عطیات دیتے ہیں، ہم لوگ جلوس لے کر صبح کو نکلتے تھے اور مبارکپور کے محلوں کا گشت لگاتے ہوئے تقریبًا چار بجے شام کو لوٹتے تھے، تو یہی سب ہماری دلچسپیاں تھیں کیونکہ بیرونی دنیا سے ہمارا کوئی تعلق یا رابطہ تو تھا نہیں کہ ہم کوئی منصوبہ یا پلان بناتے، البتہ ذہنی طور پر ہم مقرر بننے کا عزم رکھتے تھے، اس لیے کہ انہی کی پذیرائی تھی، اس وقت عوامی فیلڈ میں کام کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔

سوال:- تعلیمی اوقات کے علاوہ اور آپ کی کیا مشغولیات ہوا کرتی تھیں؟

جواب:- صبح ۸/بجے سے ۱۲/بجے تک تو درس ہوا کرتا تھا، اس بیچ کوئی دوسری مشغولیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، اور اگر کوئی گھنٹی خالی ہوتی تھی تو اس میں ہم لوگ تکرار کیا کرتے تھے، ۱۲/بجے چھٹی ہو جاتی تھی اس کے بعد ۲/بجے سے پھر مدرسہ شروع ہوتا تھا، کھانے کے لیے ہماری جاگیریں کافی دور ہوا کرتی تھی اس لیے جاتے آتے وقت ختم ہو جاتا تھا، اس بیچ صرف اتنا ہی موقع مل پاتا تھا کہ ہم لوگ ظہر کی نماز ادا کر سکیں، طلبہ عصر کے بعد تفریح کے لیے نکل جاتے تھے، میں بھی نکلتا تھا، عام طور پر طلبہ سڑک کے کنارے ٹہلتے رہتے تھے جبکہ میں تقریر کی مشق کرنے کے لیے اس وقت جہاں اشرفیہ سے تھوڑی دور پر

ایک مزار ہے جسے ''نواکا شہید'' کا مزار کہتے ہیں، وہاں چلا جایا کرتا تھا، وہ جگہ کافی سنسان ہوا کرتی تھی اور وہاں کافی تعداد میں لاہوری اینٹیں پڑی ہوتی تھیں تو ان کو میں کھڑا کر کے انہیں مجمع متصور کر لیا کرتا تھا اور ان کے سامنے جو رٹی ہوئی تقریریں تھیں انہیں دہرایا کرتا تھا اور اس میں کچھ اپنی طرف سے بھی ملاتا تھا، اس وقت حافظ ملت نے ایک رجسٹر تیار کیا تھا جس میں وہ طلبہ کے لیے مختلف تقاریر لکھ کر رکھا کرتے تھے اور جن طلبہ کو تقریر سے دلچسپی ہوتی تھی وہ نقل کر لیا کرتے تھے، میں نے بھی اس رجسٹر سے کئی تقریریں نقل کی تھیں۔ ان میں حافظ ملت کی لکھی ہوئی ایک تقریر تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض پر تھی جس کا میں حافظ تھا، اس تقریر کو میں نے غازی پور کے ایک عظیم الشان جلسے میں کیا تھا، اس جلسے میں حافظ ملت کے ساتھ ہی گیا تھا، تقریر کے دوران حافظ ملت اس طرح داد دے رہے تھے کہ جیسے انہوں نے تقریر کے نکات پہلی بار سنے ہوں حالانکہ یہ تقریر انہی کی لکھی ہوئی تھی، حافظ ملت کی انہی خوبیوں کی وجہ سے طلبہ کی شخصیت کی تعمیر ہوتی تھی۔ تقریر کے بعد حافظ ملت کے سامنے لوگ میری تعریف کرنے لگے تو انہوں نے میرا ذکر اس طرح کیا کہ گویا یہ میری ہی تیار کردہ تقریر ہے اور اسے میں نے فی البدیہہ کیا ہے اور فرمایا کہ وہ ذہین طالب علم ہے اور اللہ رب العزت نے اسے فکر رسا عطا کی ہے۔

ہمارے زمانے میں قاری عثمان اعظمی صاحب تھے جو شعبۂ تجوید کے مدرس تھے، ان میں مضمون نگاری کی کچھ صلاحیت تھی، وہ اکثر مضمون لکھا کرتے تھے، جو لڑکے ان سے قریب تھے یا ان سے متاثر تھے ان پر بھی ان کے تحریری اثرات پڑ گئے تھے اور انہیں بھی لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، میں نے بھی قرأت عاصم بروایت حفص کی تکمیل انہی سے کی، اس وقت میرے ساتھ مفتی شریف الحق بھی تھے۔

سوال:- حافظ ملت علیہ الرحمہ کا طریقۂ درس کیا تھا؟

جواب:- حافظ ملت کا طریقۂ درس ساری دنیا سے نرالا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اسے حضرت صدر الشریعہ کے طریقۂ درس سے اخذ کیا تھا، وہ عبارت پڑھواتے تھے، عبارت پڑھوانے کے بعد ترجمہ کرواتے تھے، عبارت میں صرفی اور نحوی غلطی ہوتی تھی تو اس کی اصلاح کرتے تھے، ترجمہ کے بعد اپنے لفظوں میں مفہوم بتاتے تھے کہ مصنف کی

مراد اس عبارت سے کیا ہے، یہ مفہوم اتنے آسان اور مختصر لفظوں میں بتاتے تھے کہ ہر طالب اس کو اچھی طرح سمجھ لیا کرتا تھا، پھر انہوں نے جو مطلب اور مفہوم بتایا ہے اس کی عبارت بھی حامل ہے یا نہیں، یہ بھی ایک بنیادی چیز ہے، ایسا تو نہیں ہے کہ انہوں نے جو مفہوم و مطلب بتایا وہ عبارت سے نہیں نکلتا، اس دشواری پر قابو پانے کے لیے حضرت شروع سے اس کا لفظی ترجمہ شروع کرتے تھے، اس کے بعد ہر طالب علم کے ذہن میں پوری عبارت اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی تھی، یعنی پہلے نفس مسئلہ سمجھاتے تھے پھر عبارت کے ساتھ اس کی مطابقت کرواتے تھے، اس طرح سے پوری کتاب طالب علم کے ذہن میں اتر جاتی تھی۔
اس کے علاوہ ہمیشہ سے حضرت کا دستور تھا کہ گھنٹی شروع ہونے سے پانچ منٹ قبل یا درس ختم ہونے کے بعد پانچ منٹ طلبہ کے تابناک مستقبل کے لیے ہدایات اور نصیحتیں فرمایا کرتے تھے، کبھی تقویٰ کے تعلق سے، کبھی اخلاص، ایثار، تصلب فی الدین، پاکیزگی، اعلیٰ کردار اور دینی سرگرمیوں کے تعلق سے ہدایتیں فرماتے تھے، یعنی کردار سازی اور شخصیت سازی کا کام جس طرح انہوں نے اپنے حلقۂ درس میں کیا ہے شاید کسی مدرس نے نہیں کیا ہوگا۔

سوال:- آپ کے امتحانات وغیرہ کیسے ہوتے تھے؟

جواب :- امتحانات کا جو آج طریقہ ہے، ویسا اس وقت تو نہیں تھا، ہمارے اس وقت کے جو بڑے مدارس تھے، مثلاً احسن المدارس کانپور، جامعہ حمیدیہ رضویہ بنارس، جامعہ منظر الاسلام، مظہر اسلام بریلی، جامعہ نعیمیہ مرادآباد وغیرہ یہاں سے اساتذہ تشریف لاتے تھے اور عموماً زبانی امتحانات لیا کرتے تھے، مجھے یاد ہے کہ بخاری شریف کا میرا امتحان حضرت صدر الشریعہ نے لیا تھا اور کافی سراہا تھا۔

سوال:- امتحانات میں آپ کے نتائج کیا ہوا کرتے تھے؟

جواب:- میں ہمیشہ اول آیا کرتا تھا، اس وقت تمام کتابوں کے نمبر نہیں بتائے جاتے تھے بلکہ مجموعی طور پر بتادیا جاتا تھا کہ یہ اعلیٰ ہے، یہ اوسط ہے اور یہ ادنیٰ ہے، حالانکہ تمام فنون کے نمبر الگ الگ بتائے جانے چاہیے، اس سے طلبہ کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

سوال:- آپ کی فراغت کس سن میں ہوئی؟

جواب:- میری فراغت ۱۹۴۴ء میں ہوئی

سوال: حافظ ملت علیہ الرحمہ الجامعۃ الاشرفیہ کو جس قسم کی دانش گاہ میں ڈھالنا چاہتے تھے، کیا آپ اس سے ہمیں بھی آگاہ کریں گے؟

جواب: ۱۹۵۰ء کے بعد اپنی دینی و تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز جمشید پور کو بنانے کے باوجود میں ہمیشہ اشرفیہ کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں رہتا تھا اور حضرت حافظ ملت سے اس سلسلے میں ہمیشہ رابطہ رہتا تھا، ان سے اکثر ملاقاتیں بھی رہا کرتی تھیں، جمشید پور میں ان کے کچھ مریدین بھی تھے جہاں وہ ہر سال آیا کرتے تھے اور تقریباً ایک ہفتہ دس دنوں تک قیام رہتا تھا، پھر جمشید پور میں ہی میرے قائم کردہ مرکزی ادارہ جامعہ فیض العلوم کے سالانہ جلسہ دستار بندی جو کہ عین شب برات میں ہوا کرتا تھا اس میں ہر سال حضرت پابندی سے تشریف لاتے تھے، اس جلسے میں ان کی آمد کا سلسلہ نہایت پابندی سے تقریباً ۲۵ سالوں تک چلتا رہا (حضرت کی وفات کے بعد اس جلسے میں حضرت کے صاحب زادے حضرت عزیز ملت مولانا عبدالحفیظ صاحب سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ اسی پابندی اور اہتمام کے ساتھ تقریباً پچھلے ۲۵ سالوں سے تشریف لا رہے ہیں — خ۔ نورانی) گویا حضرت کے بغیر وہ جلسہ ہوا ہی نہیں، اس کے علاوہ دیگر مختلف مذہبی جلسوں میں بھی حضرت سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، تو میں ہمیشہ ان سے یہ گزارش کرتا تھا کہ حضور! آپ کی حیات میں جامعہ اشرفیہ ایک عظیم درسگاہ کی شکل میں بن سکتا ہے تو بن جائے گا ورنہ آپ کے بعد پھر اس کام کو کوئی نہیں کرسکتا، اس لیے محلے سے باہر نکلیے، چنانچہ جس وقت حضرت حافظ ملت، اشرفی روڈ پر جو عمارت ہے اس میں تھے تو بڑے پیمانے پر خاموشی سے زمینیں خریدنے لگے، کچھ زمین گرام سدھار سے بھی حاصل کی گئی تھیں، گویا حضرت اس کام کے لیے بہت مستعد ہو گئے تھے، لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ مبارکپور کی جو کمیٹی تھی وہ باہر نکلنا نہیں چاہتی تھی، وہ اس پروگرام کو قبول نہیں کرتی تھی کہ جامعہ اشرفیہ ایک دربے سے نکل کر کھلی فضا میں تعمیر ہو، اس مسئلے کے حل کے لیے حضرت سے ہم نے کہا کہ اس کمیٹی کے اوپر ایک علماء کی کمیٹی جو ایوان بالا کہلائے تشکیل دی جائے اور وہ کمیٹی اس انتظامیہ کمیٹی پر اثر انداز ہو، چنانچہ ہم نے اس کے لیے طلبہ میں تحریک پیدا کی اور ایک مشترکہ درخواست ہم لوگوں نے سرپرست اعلیٰ حضرت سرکار کلاں محمد میاں صاحب (علیہ الرحمۃ الرضوان) کو دی، یہاں تک کہ یہ بات

آئی بڑھی کہ انہیں کچھوچھہ مقدسہ سے مبارکپور تشریف لانا پڑا، وہ اپنے ساتھ مولانا غلام جیلانی میرٹھی صاحب، مولانا محمد یونس نعیمی صاحب اور مولانا محمد سلیمان بھاگل پوری صاحب کو، جو کہ اس وقت بنارس میں رہتے تھے، لیکر آئے، تو ان لوگوں نے پانچ علماء پر مشتمل ایوان بالا بنایا، اس کمیٹی میں مذکورہ تینوں علماء اور حضرت حافظ ملت خود تھے، اور ایک صاحب تھے جن کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا ہے، لیکن یہ علاج بھی کارگر ثابت نہیں ہوا۔ یہاں کی مجلس منتظمہ بے دست و پا ہوگئی، یہ ان لوگوں کے احکام کے انتظار میں رہتی تھی اور یہ لوگ کسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے بیک وقت ایک ساتھ جمع نہیں ہو پا رہے تھے، جب انہیں بلایا جاتا تو وہ کہتے تھے کہ ہم لوگ آرہے ہیں، ہم لوگ اس مسئلے کو اب حل کریں گے، لیکن اس میں تاخیر ہوتی جاتی، یہاں تک کہ حافظ ملت جب بالکل مایوس ہوگئے تو انہوں نے یہ ارادہ کرلیا کہ اگر ہم اس کام کو مبارکپور میں نہیں کر سکتے تو ہم کہیں دوسری جگہ کریں گے مگر اس کو کریں گے۔ جامعہ اشرفیہ کو عظیم درسگاہ میں تبدیل کرنے کے لیے نئی جگہ کی تلاش کے لیے حضرت نے تین آدمیوں کو مقرر فرمایا، ایک حافظ عبدالرؤف صاحب کو مولانا شفیع مبارکپوری کو اور مجھے، اس وقت ہم تینوں کی نظر میں چار جگہیں تھیں۔ ایک مغل سرائے، دوسری سلیم پور، تیسری گورکھپور اور چوتھی بلرام پور۔ اس طرح ہم تینوں سب سے پہلے مناسب جگہ کی تلاش اور علاقے کے معائنے کے لیے مغل سرائے گئے، وہاں علاقائی سطح پر معائنہ کرنے کے بعد احساس ہوا کہ یہاں زمین تو مل سکتی تھی لیکن وہاں کوئی بڑی مسلم آبادی نہیں تھی، اس لیے وہاں سے ہم لوگ سلیم پور گئے تو سلیم پور میں بھی ہم لوگوں کو کوئی خاص مسلم آبادی نہیں ملی اور زمین بھی اتنی وسیع نہیں مل سکی، اس کے بعد ہم لوگ گورکھپور گئے، وہاں ہم لوگ ایک دن رکے، وہاں کے علاقوں اور زمینوں کا جائزہ لیا تو وہ جگہ پسند نہیں آئی، اس کے بعد ہم لوگ بلرام پور چلے گئے، وہاں بہت بڑی سنی آبادی تھی بلکہ اترولہ اور اس کے آگے تک سنیوں کا گڑھ تھا، تو یہ جگہ ہم لوگوں کو آبادی کے اعتبار سے پسند آئی، وہاں ہمیں کئی سو بیگہ پر مشتمل زمین بھی مل گئی جس کی پوری قیمت اس وقت چالیس ہزار تھی، جسے دینے کے لیے ہم نے ایک آدمی کو تیار کرلیا کہ وہ خرید کر ادارے کے نام وقف کردے، چنانچہ وہاں سے لوٹنے کے بعد ہم نے حافظ ملت کو ان تمام جگہوں کی رپورٹ دی اور بتایا کہ ان

چار جگہوں میں بلرامپور کا جو علاقہ ہے وہ ہمیں پسند آیا کیونکہ وہاں مسلم سنی آبادی بھی ہے، عقیدت مندوں کا علاقہ بھی ہے اور بہت وسیع زمین بھی مل رہی ہے جس کے لیے ایک ہی آدمی تیار ہوگیا ہے اور پھر وہاں کے لوگوں کا اشتیاق بھی ہے کہ مصباح العلوم یہاں قائم ہو تو حافظ ملت نے اس کو منظور فرمالیا اور یہ فرمادیا کہ اب ہمارا یہ عظیم درسگاہ کا منصوبہ بلرامپور کی سرزمین پر پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور پھر مبارکپور سے منتقل ہونے کا ارادہ فرمالیا۔

اس بات کی خبر جب مبارکپور والوں کو ہوگی کہ حضرت مبارکپور کو چھوڑ کر بلرامپور تشریف لے جانا چاہتے ہیں تو وہ گلی آپ دیکھ رہے ہیں جہاں حافظ ملت کا دولت کدہ ہے، وہ پوری گلی اور پرانے مدرسے کا جو سائبان ہے اور پکڑی کا درخت ہے اس کے نیچے ہزاروں آدمی جمع ہوگئے۔ چنانچہ حافظ ملت باہر تشریف لائے اور پوچھا کہ کیا بات ہے، کیوں اتنی بھیڑ لگی ہوئی ہے؟ تو بہت سے لوگ رونے لگے اور حضرت کا قدم تھام لیا اور کہا کہ حضرت! ہم نے سنا ہے کہ آپ بلرامپور تشریف لے جارہے ہیں؟ کیا یہ بات صحیح ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ "ہاں! یہ بات صحیح ہے، میں تو اب زندگی کے آخری حصے سے گزر رہا ہوں، پتہ نہیں اور کتنے دن کی زندگی ہے، اس لیے میری خواہش تھی کہ میں ایک بہت بڑی درسگاہ قائم کردوں جو ملکی سطح پر اہل سنت کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز بن جائے، جو ہمارے لیے باعث افتخار بنے اور ہماری تمام دینی ضروریات پوری کرسکے، اس کے لیے ایک وسیع منصوبہ ہے، اس منصوبے کا آغاز یہاں سے ہو نہیں پارہا ہے اور یہاں سے میں مایوس ہوگیا ہوں، ایسا لگتا ہے کہ لوگ میری موت کا انتظار کر رہے ہیں، اگر میں اسی انتظار میں مرگیا تو یہ حسرت اپنے دل میں لیکر جاؤں گا، اس لیے میں نے سوچا ہے کہ جلد سے جلد اس کام کو شروع کردوں اور اب کوئی انتظار کا لمحہ میرے لیے باقی نہیں رہا"۔

تو لوگوں نے کہا کہ حضور! آپ کو معلوم ہے کہ ادارہ دارالعلوم اشرفیہ سنی عوام کا ادارہ ہے اور مبارکپور کے لوگ اسے چلاتے ہیں، اس منصوبے کے لیے مجلس منتظمہ کے رضامند ہونے کے انتظار میں کئی سال ہم نے بھی گزارے ہیں اور اب ہم بھی مایوس ہوگئے ہیں، لیکن ہم اس بات کو برداشت نہیں کرسکتے کہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں، ہم لوگوں کی بھی خواہش یہ ہے کہ یہ منصوبہ یہیں شروع ہو، اس منصوبے کو شروع کرنے کا ہم آپ کو

مکمل اختیار دیتے ہیں، اس کے لیے اب ہمیں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ان لوگوں نے تقریباً ایک ہزار سے زائد دستخطوں کے ساتھ منٹس بک میں یہ کاروائی درج کی کہ رات میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں یہ بات اتفاق رائے سے طے ہوگئی ہے کہ حضرت کو جس قیمت پر بھی ہو روکا جائے اور حضرت کو ان کے منصوبے کو شروع کرنے کے لیے مکمل اختیار دیا جائے، مبارک پور کے عوام پانچ علماء پر مشتمل ایوان بالا کو ختم کرنے کا اعلان کرتے ہیں اور حضرت کو دارالعلوم اشرفیہ کا سربراہ اعلیٰ نامزد کرتے ہیں اور تمام اختیارات ان کے حوالے کرتے ہیں۔

اس کے وقت حالات یہ تھے کہ اہل مبارک پور نے حضرت کے جانے کے غم میں کھانا پینا چھوڑ دیا تھا، ہر طرف غم کی لہر تھی، لوگوں کے گھروں میں چولہے نہیں جلے، رونا بلکنا جاری تھا، جب یہ خبر حضرت کو پہنچی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور فرمایا کہ "میں ان کے جذبہ اخلاص کی قدر کرتا ہوں اور ان کی محبتوں کے آگے میں اپنا ارادہ بدلتا ہوں، ان سے کہہ دیں کہ میں کہیں نہیں جاؤں گا اور اب ان شاء اللہ یہ کام یہیں ہوگا"۔ اس کے بعد میں چلا گیا اور پھر کچھ دنوں کے بعد حضرت نے مجھے جمشید پور سے طلب فرمایا اور یہ بات طے پائی کہ جو زمین خریدی گئی ہے اس منصوبے کے لیے اس زمین پر ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی جائے اور اس تعلیمی کانفرنس میں اس کا سنگ بنیاد رکھا جائے، اس سلسلے میں ہمارے ذمہ حضرت نے دو کام لگائے، ایک تو یہ کہ جو مرکزی درسگاہ بنے گی اس کا نقشہ آپ جمشید پور میں بنوائیں، اس سلسلے میں میں جمشید پور کے ایک بہت بڑے بنگالی انجینیئر کو لے کر مبارک پور آیا اور اس کو جائے وقوع دکھلایا اور پھر اس کے بعد اس نے بہت شاندار نقشہ بنایا، اس نے مرکزی درسگاہ اور ہاسٹل دونوں کا نقشہ بنایا تھا مگر کچھ وجوہات کی بنا پر ہاسٹل کی تعمیر اس کے نقشے پر نہ ہوسکی مگر مرکزی درس گاہ کی تعمیر اس کے نقشے پر ہوئی۔ اس کے علاوہ حضرت نے تعلیمی کانفرنس کے انتظام وانصرام کی پوری ذمہ داری بھی دی، چنانچہ اس سلسلے میں میں ایک ماہ تک مبارک پور میں رہ گیا، مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں کانفرنس کے سلسلے میں زمین کو مختلف خطوں میں تقسیم کر رہا تھا تو آپ (مولانا بدرالقادری) آئے اور آکر مجھ سے کہا کہ "حضرت! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے بھی عطا کریں"۔ صرف اتنا

یاد ہے۔لیکن میں نے آپ کے ذمہ کون سا کام لگایا تھا وہ یاد نہیں ہے۔ بہر حال وہ تعلیمی کانفرنس پورے جوش وخروش سے بہت بڑے پیانے پر منعقد ہوئی، اس میں سنگ بنیاد کا بھی پروگرام تھا، اس لیے اس کانفرنس میں سنگ بنیاد رکھنے کے لیے حضرت مفتی اعظم ہند، حضرت سید العلماء، حضرت مجاہد ملت اور ان کے علاوہ دیگر اکابر بھی تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر ایک افسوس ناک واقعہ یہ بھی ہوا تھا کہ کچھ لوگوں نے اعظم گڑھ میں اس کانفرنس اور سنگ بنیاد کو روکنے کے لیے درخواست دے دی تھی، مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کانفرنس اور سنگ بنیاد سے تین دن قبل وہ درخواست مسترد کردی گئی اور جن لوگوں نے درخواست دی تھی انہیں Stay Order میں ناکامی ہوئی۔ اس کانفرنس میں ہزاروں کی تعداد میں علماء تشریف لائے تھے، اشرفیہ کے سارے تلامذہ اور فارغ التحصیل علماء موجود تھے، عوام کا بھی بہت بڑا مجمع تھا، لوگوں کا کہنا تھا کہ مبارکپور کی سرزمین پر کبھی اتنی بڑی کانفرنس منعقد نہیں ہوئی تھی، گاڑیاں، کاریں، بسیں اور جیپیں اس قدر آ گئی تھیں کہ انہیں کھڑی کرنے کے لیے مناسب جگہ نہیں ہو پا رہی تھی، اسی طرح سیکڑوں دکانیں بھی لگی تھیں۔

اس کانفرنس میں ایک واقعہ اور بھی پیش آیا تھا وہ یہ کہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے بنارس سے مولانا صفی اللہ بھی آئے تھے، انہیں دیکھ کر مجاہد ملت نے حافظ ملت سے فرمایا کہ صفی اللہ اگر اسٹیج پر چڑھیں گے تو میں اسٹیج پر نہیں جاؤں گا، اس لیے کہ وہ سلیم اللہ کا بھائی ہے اور سلیم اللہ کے ساتھ ساتھ اس کا بھی بدمذہبوں اور بے دینوں کے ساتھ اختلاط ہے، اب تک حافظ ملت کو یہ تفصیلات نہیں معلوم تھیں، اس لیے ان کے نام بھی دعوت نامہ گیا تھا اور وہ آئے تھے، جب حضرت مجاہد ملت نے یہ فرمادیا تو حضرت حافظ ملت کی پریشانی بڑھ گئی، اب آخر کیسے مولوی صفی اللہ کو وہ اسٹیج پر جانے سے منع کریں؟ پھر حضرت نے مجھے بلایا اور ساری تفصیلات بتا کر فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ اس پریشانی کا حل ضرور تلاش کرلیں گے، اس لیے جلدی ہی اس کا کوئی حل تلاش کریں، میں نے یہ سن کر حضرت سے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں، یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے، ان شاء اللہ اس کا کوئی حل نکل آئے گا۔ آپ حضرت مجاہد ملت سے فرمادیں کہ مولانا صفی اللہ اسٹیج پر نہیں جائیں گے اور آپ ان کو لے کر اسٹیج پر تشریف لے چلیں۔ اس کے بعد میں نے مولانا صفی اللہ کو بلا کر کہا کہ آج مجھے

آپ کی ضرورت ہے، آپ انتظام وانصرام میں میرا ہاتھ بٹائیں، وہ تیار ہو گئے، تو میں نے ان سے کہا کہ آپ آج آفس میں میری جگہ تشریف رکھیں کیونکہ آج مجھے آپ کی وہاں ضرورت ہے اور اسٹیج پر تشریف نہ لیجائیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، لیکن بات چھپتی نہیں ہے، دوسرے دن انہیں ساری بات معلوم ہو گئی اور پھر انہوں نے بنارس جانے کے بعد ایک نہایت دردناک خط لکھا، اس میں انہوں نے کہا کہ "مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ اس فیصلے سے اتفاق کریں گے جس کا تعلق میرے دین و مذہب اور تصلب فی الدین سے ہے"۔ پھر میں نے انہیں جواب دیا کہ میرے پاس سوائے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا، کیونکہ مجاہد ملت اسٹیج پر تشریف نہ لاتے اور اعلانیہ چلے جاتے، وہ اگر اعلانیہ چلے جاتے تو صحیح بات تو عوام تک نہیں پہنچتی یا لوگ نہیں پہنچاتے اور افواہ اڑتی کہ مجاہد ملت تعلیمی کانفرنس سے واپس چلے آئے تو پھر مجاہد ملت کے جو عقیدت مند تھے، ان کی مریدین اور تلامذہ تھے وہ بھی واپس آجاتے، پھر بہت بڑی تعداد میں علماء چلے جاتے تو اس کا اثر اس کانفرنس پر کیا پڑتا؟ اس پوری تحریک پر کیا پڑتا؟ اور پھر مجھ پر کیا پڑتا؟ کہ حضرت نے اس کانفرنس کی پوری ذمہ داری میرے ہی کاندھوں پر ڈالی تھی، اس کے علاوہ ایک بہت بڑا حریف طبقہ پہلے ہی سے موجود تھا جسے ایک بڑا موقع ہاتھ لگ جاتا کہ سنی علماء اور عوام نے اس تحریک کو مسترد کر دیا کیونکہ سادات کچھوچھہ اس تحریک کے ساتھ نہیں ہیں تو پھر اس سے اشرفیہ کے کاز کو نقصان پہنچتا، اس لیے آپ گہرائی میں اتر کر حالات پر غور کریں اور سوچیں کہ اس کے علاوہ میرے پاس اور کیا راستہ تھا؟ بہرکیف وہ مطمئن ہوئے یا نہیں ہوئے یہ تو میں نہیں جانتا، لیکن مین نے انہیں جواب دے دیا تھا، میں نے جو جواب دیا تھا وہ حقیقت بھی تھا کہ اگر مجاہد ملت چلے جاتے تو وہ اکیلے نہیں جاتے بلکہ ان کے ساتھ بہت سارے علماء مریدین اور عقیدت مند بھی چلے جاتے اور مبارکپور کا ایک طبقہ جو اس کانفرنس اور سنگ بنیاد کی تقریبات نہیں ہونے دینا چاہتا تھا وہ اپنے تخریبی مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔

اس کانفرنس کے لیے خطبۂ استقبالیہ جسے قاری یحییٰ صاحب نے پڑھا تھا اس کو بھی میں نے اپنے قلم سے لکھا تھا اور اسے کلکتہ سے چھپوا کر لایا تھا، کانفرنس کے لیے سارے بیچ Batch وغیرہ بھی میں نے کلکتہ سے ہی بنوائے تھے، پروگرام کی نظامت بھی میں نے ہی

کی تھی، چنانچہ اس کانفرنس کی کامیابی کے ساتھ ختم ہونے کے بعد حافظ ملت مجھے گلے سے لگا کر بہت روئے اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

سوال:۔الجامعۃ الاشرفیہ کے سلسلہ میں حافظ ملت کے مجوزہ پروگرامات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے آپ نے کیا مساعی کیں؟

جواب:۔زمانہ طالب علمی سے لیکر اب تک میں ہمیشہ جامعہ اشرفیہ کی تعمیر وترقی کے لیے کوشاں رہا اور حسب استطاعت مساعی کرتا رہا جس کی وجہ سے ہمیشہ حافظ ملت مجھ پر حد درجہ کرم فرماتے تھے اور مجھے عزیز رکھتے تھے، اشرفیہ کے مجوزہ پروگرامات کے لیے خواہ عوامی ذہن سازی کا مسئلہ ہو، زمین کی خریداری کا ہو، تعلیمی کانفرنس اور سنگ بنیاد کے انتظام وانصرام کا ہو، عوامی چندے کا، عمارتوں کی تعمیر کا، یا ادارہ کی دستور سازی کا، ہر کام کے لیے میں نے بڑھ چڑھ کر خدمات پیش کیں اور ادارہ کو ملکی سطح پر اہل سنت کا مرکزی ادارہ بنانے کے لیے ہمیشہ حافظ ملت کے ساتھ لگا رہا۔

اس کے علاوہ ایک نہایت اہم بات جس کی وجہ سے اشرفیہ کی تحریک میں خلل پڑ رہا تھا، وہ سادات کچھوچھہ کی اشرفیہ سے ناراضگی تھی، اس نزاع کے تصفیہ کے لیے میں اور حافظ ملت دونوں تعلیمی کانفرنس سے پہلے حضرت سرکار کلاں محمد میاں صاحب کو منانے کے لیے کچھوچھہ گئے تھے، شاید یہ بات کم ہی لوگوں کو معلوم ہو، کیونکہ پہلے جو دستور بنا تھا اس میں سادات کچھوچھہ کا کوئی نہ کوئی بزرگ اشرفیہ کا سرپرست ہوا کرتا تھا، حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمہ سے لیکر یہ سلسلہ حضرت محمد میاں صاحب تک چلا، جب تعلیمی کانفرنس سے پہلے اس میں ترمیم اور حذف واضافہ کیا گیا تو حضرت محمد میاں کو پہلے ہی کی طرح سرپرست رکھا گیا تھا، لیکن کام کرنے کی حیثیت سے زیادہ تر اختیارات حافظ ملت کی طرف منتقل کردیے گئے تھے، دستوری کتاب میں سرپرست کی حیثیت سے ان کا نام بھی چھپا تھا لیکن کچھ مسائل تھے جس کا اعادہ اس وقت مناسب نہیں، جس کی وجہ سے سادات کچھوچھہ ناراض تھے، بہرکیف اس مسئلے کے تصفیہ کے لیے میں اور حافظ ملت غالبًا عرس حضرت مخدوم اشرف رضی اللہ عنہ کے موقع پر حضرت سرکار کلاں کو منانے کے لیے گئے اور ہم لوگوں نے حضرت سے درخواست کی کہ تعلیمی کانفرنس میں وہ بحیثیت سرپرست شرکت فرمائیں اور جو کچھ بھی ماضی

میں ہوا ہے اس سے حضرت کی دل شکنی ہوئی ہے تو حضرت اسے معاف فرمائیں، یہاں تک کہ حافظ ملت نے ان کا پاؤں پکڑ لیا، تو انہوں نے فرمایا کہ اچھا دیکھوں گا خاندان کے لوگوں سے مشورہ کروں گا۔ کئی دن حضرت کے گھر پر ہم لوگوں نے قیام کیا مگر ان لوگوں نے کافی سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور بات کرنے کو تیار نہیں ہوئے بلکہ عرس کے موقع پر حضرت حافظ ملت کے خلاف پوسٹر بھی نکال دیا گیا جس سے دل برداشتہ ہو کر ہم واپس آ گئے۔ حضرت حافظ ملت جب کچھوچھہ سے لوٹ رہے تھے تو بہت کرب میں تھے، چوں کہ عرس کے موقع پر جو دل خراش پوسٹر تقسیم ہوا تھا وہ پورے ملک میں پھیل جاتا اور پھر لوگوں کو بدگمانیاں ہوتیں اس لیے لوٹنے کے بعد میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اس پوسٹر سے عوام میں جو بدگمانیاں پھیلیں گی انہیں دور کرنے کے لیے اس کا جواب ضرور ہونا چاہیے، مگر حضرت نے فرمایا کہ جواب کے چکر میں مت پڑو اور معاملہ کو اللہ کے حوالے کردو، میں نے کہا کہ اللہ کے حوالے تو کرنا ہی ہے لیکن یہ پوسٹر جب عوام تک پہنچے گا تو رائے عامہ بدگمانیوں کا شکار ہو سکتی ہے ،اس لیے جو اصل واقعہ ہے وہ سنی عوام کو معلوم ہونا چاہیے، ہم کوئی ایسا جواب نہیں لکھیں گے کہ ان کی کوئی تنقیص یا مذمت ہو بلکہ اصل واقعہ کو پیش کر دیں گے، پھر میں نے اشتہار مرتب کیا جس میں میں نے اس بات پر زور ڈالا کہ ہمیں یہ بالکل امید نہیں ہے کہ اس طرح کا پوسٹر صاحب سجادہ کی طرف سے ہو سکتا ہے، یہ تو دوسرے افراد ہیں جو اس خلیج کو اور بڑھانا چاہتے ہیں، اور پھر میں نے نہایت سلیقے سے اپنی بات لکھ دی، اس تحریر کو جب میں نے حافظ ملت کو سنایا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور حضرت نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا، اس کے بعد وہ اشتہار چھپا اور پورے ملک میں تقسیم ہوا۔

تعلیمی کانفرنس اور سنگ بنیاد کے بعد چندے کے لیے میں نے حضرت حافظ ملت کو جمشید پور آنے کی دعوت دی اور وہ تشریف لائے، اس زمانے میں مجوزہ منصوبے کے لیے میں نے ایک دن میں ۸۰ ہزار روپے چندہ کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کیا، اس کے بعد مزید چندے کے لیے میں حضرت کے ساتھ ممبئی، بھیونڈی اور بہت سے شہروں میں گیا، ہمارا یہ سفر تقریباً ایک مہینے کا تھا۔ اس کے علاوہ مبارکپور میں جب بھی کوئی بڑا جلسہ ہوتا تھا تو اس میں شریک ہوتا تھا اور حضرت کے ایماء پر چندے کی اپیل کرتا تھا، چندے کی اس اپیل

میں ہمیشہ کمرہ مانگتا تھا، ممبئی اور بھیونڈی وغیرہ میں میں نے کمرے ہی مانگے، میری اپیل کے دوران جب کوئی کسی کمرہ کی تعمیر کے لیے راضی ہو جاتا تو پیچھے سے حضرت خوشی سے فرماتے جزا کم اللہ خیر الجزاء اور پھر کھڑے ہو کر میرے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تھے، پھر کوئی کمرہ ملتا تھا تو پھر یہی عمل دہراتے یعنی جزا کم اللہ کہتے اور کھڑے ہو کر میرے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تھے، اسی طرح سے میں نے اپنے جلسوں میں تقریروں کے ذریعے کمرے بہت حاصل کیے، اس مہم کے لیے اس زمانے میں میں اپنے ساتھ مولانا اسرار الحق کو بھی لے گیا تھا، انہوں نے بھی چندے کے لیے اچھی تقریریں کیں، اس سفر کے بعد اشرفیہ کے مجوزہ پروگرام کے لیے ممبئی وغیرہ کی فضا استوار ہوئی۔ اس وقت سادات کچھوچھہ کی ناراضگی کے باوجود مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اشرفیوں نے ہماری بہت مدد کی، یہاں تک کہ بعد میں میں اپنے ساتھ مولانا سید مظفر حسین کو بھی لے آیا، انہوں نے بھی اپنی تقریر میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس ناراضگی کی وجہ سے مبارکپور کا وہ طبقہ جو کچھوچھہ سے وابستہ تھا اور ہمارا حریف ہو گیا تھا، اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس طبقے پر مخالفت کا جو جذبہ تھا وہ ختم ہو گیا۔

بہرحال یہاں مزید تفصیل کا موقع تو نہیں ہے مجھ سے جو بھی بن پڑا میں نے کیا، کرتا رہا اور ان شاء اللہ آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ اب میرا اس سلسلہ میں پلان یہ ہے کہ جامعہ اشرفیہ کی سند کو جامعہ ازہر قاہرہ منظور کرلے، اس کے لیے مجھے اقدام کرنا ہے، مولانا قمرالزماں اعظمی بھی یہاں آئے تھے تو ان سے ہمارا مشورہ ہوا ہے، اس سلسلے میں پیش قدمی کے لیے انگلینڈ کے ڈاکٹر ذکی بداوی صاحب نے ایک راستہ بتایا ہے کیونکہ وہ خود وہیں کے فارغ ہیں، ان شاء اللہ اس راستے پر میں عمل کروں گا۔ ان شاء اللہ جنوری کے آخری ہفتے میں جب میں ہندوستان واپس جاؤں گا تو مبارکپور جاؤں گا اور ۱۰ دن وہاں قیام کرکے جو خاکہ ہم لوگوں نے طے کیا ہے اس کے مطابق میں پروگرام بناؤں گا۔

سوال:۔ آپ کی توجہات نے ہندوستان کے ہر گوشے میں مدارس اور جامعات کے جال بچھا دیے ہیں، جیسا کہ کسی ذہین کا قول ہے کہ "علامہ صاحب ہندوستان کو اتنے مدارس عطا کرنا چاہتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر نے جتنی مساجد دی ہیں" یہ تمام خدمات

لائق تحسین ہیں مگر کیا مادر علمی ہونے کے سبب الجامعہ الاشرفیہ آپ کی جتنی خدمات کا مستحق ہے، آپ نے اسے دیں؟ ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ اگر آپ اس مرکز کو بلند کرنے پہ لگ جائیں تو عالم اسلام سے اس کومربوط کرانا کوئی دشوار امر نہیں ہوگا۔

جواب:۔ یہ تو بہت ہی پیچیدہ سوال آپ نے ہم سے کر دیا (ہنستے ہوئے) میں آپ کو یاددلانا چاہوں گا کہ جب میں پہلی مرتبہ ہندوستان سے برطانیہ کے لیے سفر پر روانہ ہوا تھا تو تین دنوں کے لیے میں قاہرہ میں اترا تھا، دراصل قاہرہ میں اترنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت امام احمد رفاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا مزار مبارک قاہرہ میں ہے، ان کے بارے میں میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جب وہ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے حضور کے روضۂ پاک پر تو انہوں نے صلاۃ وسلام کے بعد یہ درخواست پیش کی کہ صلاۃ وسلام کی تکمیل مصافحہ سے ہوتی ہے، میری تمنا ہے کہ حضور سے مصافحہ کا شرف حاصل ہو، چنانچہ ان کی یہ درخواست بارگاہ رسالت میں قبول ہوگئی اور حضور کا چمکتا ہوا دست مبارک جالیوں کے باہر نمودار ہوا اور حضور نے مصافحہ کیا، اس مجمع میں حضرت غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے اور تقریباً ستر ہزار کا مجمع تھا، اس کا سب نے مشاہدہ کیا، اس کے بعد پھر دونوں ہاتھ اندر چلے گئے، اس واقعہ کو پڑھ کر میں حضرت کی ذات سے بہت زیادہ متاثر تھا اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ حضرت کا مزار مبارک قاہرہ میں ہے، اس لیے میں قاہرہ اتر گیا، تو جب میں ہندوستان سے چلنے لگا تو میرا یہ سفر چونکہ برطانیہ کے لیے تھا اس لیے اکس چینج میں مجھے ڈالر لینے کے لیے ہندوستانی ۷۵ روپے جمع کرنے پڑے تو مجھے ساڑھے تین ڈالر ملے تھے، اصل میں یہ ٹیکسی کا کرایہ تھا کہ آدمی لندن ایئرپورٹ پر اتر کر اپنی قیام گاہ تک جائے، تو میرے پاس ساڑھے تین ڈالر ہی تھے جب میں قاہرہ اتر کر ایمگریشن میں درخواست دی کہ مجھے شہر میں جانے کے لیے اجازت دی جائے تو انہوں نے سب سے پہلے اس کے لیے ایک ڈالر کی فیس مجھ سے وصول کی اور ایک فارم دیا کہ اس کو بھر دیجئے۔ اس میں ایک خانہ یہ بھی تھا کہ قاہرہ میں آپ کہاں ٹھہریں گے تو مجھے تو کسی آدمی کا نام معلوم نہیں تھا، اس لیے میں نے امام رفائی کا نام اس پر لکھ دیا کہ میں ان کی درگاہ میں ٹھہروں گا، اس وقت میرا تصور یہ تھا کہ جیسے ہمارے یہاں اجمیر شریف وغیرہ میں زائرین کے رہنے سہنے کا انتظام اور کھانے کے لیے لنگر وغیرہ کا انصرام

ہوتا ہے۔ایسے یہاں پر بھی ہوگا،اب میرے پاس ڈھائی ڈالر بچے،خیر سامان وغیرہ لے کر
جب میں باہر نکلا تو ٹیکسی والے کھڑے تھے،انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں جانا ہے،
میں نے انہیں بتایا کہ حضرت امام رفاعی کے مزار پر،تو ان میں سے ایک تیار ہوگیا اور کہا کہ
چلیے،قاہرہ ایئرپورٹ سے ان کا مزار غالبًا ۹ رکلومیٹر کی دوری پر ہے،اس نے مجھے ایک مسجد
کے پاس چھوڑ دیا اور ایک ڈالر مجھ سے لے لیا،اب میرے پاس ڈیڑھ ڈالر بچ گئے، مجھے
قاہرہ پر رکنے کے لیے تین دنوں کی اجازت ملی تھی،اس کے حساب سے میں نے آگے
برطانیہ جانے کے لیے ایرویز میں اپنی سیٹ بک کرائی تھی،بہرکیف!اس نے مسجد کے پاس
مجھے چھوڑ دیا جس کے اندر ہی مزار شریف تھا اور قاہرہ میں غالبًا ہر مسجد کے اندر کوئی نہ کوئی
مزار آپ کو ملے گا،وہ مسجد اتنی ہی بلندی پر تھی جتنی بلندی پر دہلی کی جامع مسجد ہے،اب
میرے پاس دو بڑے سوٹ کیس اور ایک بیگ تھا،میں اتنا وزنی سامان لیکر اتنی لمبی سیڑھیاں
چڑھنے لگا،چڑھتے چڑھتے بری حالت ہوگئی،میرے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ میں کوئی ہوٹل یا
قلی کرتا،میرے پاس کل ڈیڑھ ڈالر بچے تھے،اسی میں مزار سے ایئرپورٹ اور پھر برطانیہ
جانا تھا،اور پھر تین دنوں تک قاہرہ میں رہنا تھا،اسی میں کھانا پینا بھی تھا،یہاں میں نے
بزرگوں کا چشم دید تصرف ملاحظہ کیا،جس کو دلیلوں سے کوئی کاٹ نہیں سکتا ہے کیونکہ یہ میرا
اپنا مشاہدہ تھا،بہرحال میں جب ہانپتا ہوا مسجد کے دروازے پر پہنچا تو دربانوں نے مجھے
روک دیا اور عربی میں پوچھنے لگے کہ کیا ہے یہ؟اور تم کون ہو،اور کیا کرنے آئے ہو؟میں
نے عربی میں انہیں جواب دیا کہ ہندوستان سے آرہا ہوں اور میں حضرت کے مزار شریف
کی زیارت کے لیے حاضر ہوا ہوں،انہوں نے کہا کہ یہ مسجد ہے اس میں مزار ہے اور یہاں
ٹھہرنے اور کھانے پینے کی کوئی جگہ نہیں ہے اور سامان لیکر آپ اندر نہیں جاسکتے،یہ
مسافر خانہ نہیں ہے، سامان آپ باہر رکھیے اور جائیے فاتحہ پڑھیے اور پھر واپس چلے
جائیے،تو میں نے اس سے پوچھا کہ وضوخانہ کدھر ہے؟اس نے راستہ بتادیا اور میں سارا
سامان وہاں رکھ کر وضو کرنے چلا گیا،اس وقت میرے دل کی کیفیت کیا تھی میں بیان نہیں
کرسکتا،میں یہ سوچ سوچ کر پریشانی کے عالم میں پسینے پسینے ہو رہا تھا کہ اب میں یہاں سے
کہاں جاؤں گا،میرے پاس تو کل ڈیڑھ ڈالر ہی ہیں،اب میں کیا کروں گا،کہاں سے تین

دن گزاروں گا، یہ سوالات غم کے پہاڑ کی طرح میرے اوپر ٹوٹ پڑے، خیر اس کی بتائی ہوئی جگہ پر میں وضو کرنے جا رہا تھا اور میرا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا، جب وضو خانے میں میں وضو کرنے کے لیے بیٹھا اور جیسے ہی میں نے ہاتھ دھویا، میں اس وقت بھوکا پیاسا بھی تھا اور پانی منہ میں لیکر کلی کی، یک بیک مجھ پر ایک رقت طاری ہوگئی، اپنی بے بسی، بے کسی، غریب الوطنی اور مسافرت پر رونا آنے لگا اور دل میں اچانک یہ بات آئی کہ حضرت میں تو بمبئی سے جب چلا تھا تو اس وقت یہ نیت کرلی تھی کہ آپ کے در اقدس پر حاضری دونگا، اسی وقت آپ کو خبر ہوگئی ہوگی کہ کوئی آپ کا عقیدت مند آرہا ہے، یہ تو میرا عقیدہ ہے، جب میں یہاں اترا ہوں تب بھی آپ کو معلوم ہے کہ میں یہاں آگیا ہوں، تو کیا کسی آنے والے مہمان کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے؟ آپ تو عرب ہیں اور عرب تو بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں، آپ اللہ کے ولی بھی ہیں، آپ پر تو سب روشن ہے، میرے لیے یہاں آپ کے دربان نے پہرہ لگا دیا، وہ کہتا ہے کہ وضو کرو، فاتحہ پڑھو اور جاؤ، اب میں کہاں جاؤں؟ یہی سب میرے دل میں آرہا تھا اور میری آنکھیں اشک بار ہوگئی تھیں، ابھی اسی ادھیڑ بن میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اللہ گواہ ہے کہ اپنے پیچھے مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی، کوئی تیزی کے ساتھ میری طرف آرہا تھا، یہاں تک کہ اس کے قدموں کی چاپ قریب تر سنائی دینے لگی، خیر وہ سامنے آیا اور جہاں میں وضو کر رہا تھا اسی جگہ آکر کھڑا ہوگیا اور عربی میں مجھ سے کہا کہ کیا تم ہندوستان سے آئے ہو؟ میں نے کہا ، ہاں! تو اس نے کہا کہ میرے ساتھ آؤ، میں نے کہا بس میں وضو کرلوں تو پھر تمہارے ساتھ چلتا ہوں، اتنی دیر تک وہ کھڑا رہا، جس وقت اس نے پوچھا تھا کہ تم ہندوستان سے آئے ہو؟ بس اسی وقت مجھے اطمینان ہوگیا اور میں نے سمجھ لیا کہ میرے دل کی خاموش فریاد یا خاموش استغاثہ حضرت کی بارگاہ تک پہنچ گیا ہے اور یہ حضرت ہی کا تصرف ہے، چنانچہ میں نے اطمینان سے وضو کیا اور پھر اس کے پیچھے پیچھے چلا، وہ مجھے راہداریوں سے لیکر چلتا ہوا ایک نہایت کشادہ اور سجے سجائے کمرے میں پہنچا، اس کمرے کے باہر نہایت خوبصورت پردہ پڑا ہوا تھا، پردہ ہٹا کر جب میں کمرے کے اندر گیا تو دیکھا کہ ایک باریش، روشن پیشانی اور سفید مرقع بزرگ کرسی پر تشریف فرما ہیں- انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا مرحبا مرحبا اہلاً وسہلاً

،اہلا وسہلا، اس جملے کوانہوں نے کئی مرتبہ دہرایا، کیونکہ عرب کا دستور ہے کہ وہ بعض جملوں کو کئی کئی مرتبہ کہتے ہیں۔ پھر انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور بیٹھنے کے لیے کرسی دی، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک آدمی اسی کمرے میں میرا سامان لیتا ہوا چلا آرہا ہے۔ پھر انہوں نے زور سے تالی بجائی تو ایک آدمی آ کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، اس سے انہوں نے کہا کہ ناشتہ لے کر آؤ، تھوڑی دیر کے بعد نہایت پر تکلف ناشتہ لے کر وہ آیا، ناشتے کے بعد انہوں نے مجھ سے بتایا کہ میں اس مسجد کا خطیب ہوں اور صاحب مزار کا میں خادم ہوں، آج جمعہ ہے، اس لیے نماز کے بعد دوپہر کا کھانا آپ میرے ساتھ میرے غریب خانے پر تناول فرمائیں گے۔ اب جو میرے دل کی کیفیت تھی میں اسے کیا بتاؤں؟ بہر حال میں ناشتے کے بعد کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے مزار مبارک پر حاضر ہوا، جیسے ہی حاضر ہوا، ایسا لگا کہ کسی نے مجھے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ہو، اس کے بعد تو مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں گھنٹوں روتا رہا، پھر اس کے بعد میں نے دیکھا کہ جمعہ کی نماز کا وقت ہو گیا اور لوگ آنے لگے، ان میں بڑے بڑے ارباب حکومت بھی تھے، لوگ آتے تھے اور حضرت کے مزار کے دروازے کی جو زنجیر تھی اس کو چومتے تھے، میں نے دیکھا کہ اس زنجیر کو اتنا چوما اور چھوا گیا ہے کہ وہ پتلی ہو گئی ہے، لوگ آتے جاتے اسے چومتے، سلام کرتے اور پھر مسجد میں چلے جاتے۔ میں بھی حاضری کے بعد مسجد میں چلا گیا، امام صاحب تشریف لائے، خطبہ دیا اور پھر جمعہ کی نماز ہوئی، نماز کے بعد میں نے دیکھا کہ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے بہت سے لوگ دو رویہ لائن لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے بیچ تک بزرگ بیٹھے تھے، جنہوں نے بھی ترکی ٹوپی لگا رکھی تھی، مگر اس کے اوپر ایک سفید پٹی بھی لگی ہوئی تھی، جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ مجاز وخلیفہ ہیں۔ خیر میں بھی وہاں بیٹھ گیا، وہاں حضرت امام رفاعی کا اسم الجث جو ایک وظیفہ ہے وہ پڑھا گیا، پھر فاتحہ ہوئی اور پھر سب لوگ مزار پر حاضر ہوئے، ایصال ثواب کیا گیا اور لوگ چلے گئے لیکن میں وہیں رک گیا۔ صبح سے جن تکلیفوں کا میں نے سامنا کیا تھا پھر جیب میں اتنا پیسہ بھی نہیں تھا کہ کہیں کچھ کھا سکوں اور قیام کر سکوں، اب جو حضرت نے کرم فرمایا تو ان کی اس فیاضی اور عنایت پر خوشیوں سے آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار جاری ہو گیا، میری یہ حالت دیکھ کر کچھ لوگ جو فاتحہ پڑھ رہے تھے، مجھ سے مصافحہ کرنے کے لیے وہیں رک

گئے، جب میں فارغ ہوا تو وہ آئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سروں پر رکھوایا، پھر وہ لوگ مجھے لے کر ایک طرف کونے میں بیٹھ گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ آپ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ وغیرہ، میں نے ان کی باتوں کے جوابات دیے- ایک نے پوچھا کہ آپ یہاں کتنے دن قیام کریں گے؟ میں نے کہا کہ تین دن، پھر میں یہاں سے لندن چلا جاؤں گا، جہاں مجھے ایک اسلامی تبلیغی مشن قائم کرنا ہے- ایک نے کہا کہ آپ ایسا کریں کہ آج رات کا کھانا میرے یہاں تناول فرمائیں، دوسرے نے کہا کہ کل دوپہر کا میرے یہاں کھائیں، تیسرے نے کہا کہ کل رات کا میرے یہاں کھائیں- ان میں ایک شخص مجھ سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا تھا، اس کا سیلون تھا یعنی بال بنانے کی دکان، وہ میرے ساتھ ساتھ امام صاحب کے یہاں گیا، امام صاحب میرے انتظار میں تھے، وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر گئے، وہاں ہم نے کھانا کھایا، کھانا کھلانے کے بعد انہوں نے اپنے بڑے لڑکے سے کہا کہ میرے حجرے میں ان کا سامان ہے، انہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤ اور وہاں سے ان کا سامان لے کر انہیں نہایت عزت و تکریم کے ساتھ رفاعیہ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہراؤ- حضرت کے قیام کے ساتھ طعام اور جملہ ضروریات کا انتظام بھی گیسٹ ہاؤس کی طرف سے کروا دو- اس طرح میں گیسٹ ہاؤس میں منتقل ہو گیا- ادھر وہ سیلون والا شخص کئی بار میری تلاش میں مسجد آیا، خیر مغرب کی نماز میں اس سے ملاقات ہو گئی- مغرب کے بعد میں پھر فاتحہ پڑھنے حاضر ہوا، پھر مجھ پر رقت طاری تھی، اسی بیچ ایک عورت اپنے بچے کو لے کر آئی، اس نے مجھے روتے ہوئے دیکھا تو اپنے بچے کو وہاں ایک سکہ دیا اور کہا کہ اس شخص کو دے آؤ- اس کے بعد میں گیسٹ ہاؤس میں چلا گیا، پھر سیلون والے کے ذریعے تمام لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میں وہاں مقیم ہوں اس لیے وہاں شام کو بہت سے لوگ آ گئے اور میری خوب آؤ بھگت ہونے لگی یہاں تک کہ اس سیلون والے اور اس کے ساتھ دوسرے لوگوں نے اپنے خرچ سے پورے قاہرہ کی سیر کرائی، جامعہ ازہر بھی لے گئے، وہاں ان لوگوں نے میری خواہش پر وہاں کے ایک نہایت ذمہ دار شخص سے ملاقات کروائی۔ میں نے انہیں اپنے بارے میں تمام تفصیلات بتائی اور پھر الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کے تمام حالات اور اس کا نقشہ ان کے سامنے بیان کیا - یہ بات ۱۹۷۰/۷۱ء کی ہے، دراصل اوپر کی تمام تفصیلات اسی حصے کو بتانے کے لیے میں

نے ضمنی طور پر بیان کی تھی۔ خیر میں نے جامعہ ازہر کے اس ذمہ دار سے بتایا کہ جامعہ اشرفیہ اس وقت برصغیر کا سب سے بڑا سنیوں کا ادارہ ہے اس کے ہزاروں طلبہ و فارغین ہیں، اتنے شعبے ہیں، اتنے رقبے پر اس کی عظیم الشان عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں وغیرہ۔

اس نے کہا کہ مجھے حیرت ہے کہ ہندوستان میں ایسی بھی کوئی درسگاہ ہے، ہم تو اب تک یہی جانتے تھے کہ وہاں ایک دارالعلوم دیوبند ہے اور ایک ندوۃ العلماء ہے۔ بہرکیف اب آپ یہ کریں کہ وہاں کے جو ذمہ دار ہیں ان سے کہیں کہ وہ مجھے وہاں کا نصاب تعلیم، ادارے کی تمام تفصیلات اور ادارے کے فوٹو وغیرہ ہمارے پاس ارسال کریں، تا کہ وہاں سے ہمارے تعلیمی اور ثقافتی روابط ہو سکیں۔ میں نے ان کا پتہ اور دیگر معلومات حاصل کیں، اس کے بعد برطانیہ پہنچنے کے بعد میں نے حافظ ملت کو خط لکھا۔ حافظ ملت بہت خوش ہوئے اور اس کے لیے تمام کاروائی کی ذمہ داری مولوی شفیع صاحب پر ڈال دی، آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولوی شفیع صاحب کے پاس جانے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کام سرد خانے بلکہ مردہ خانے میں چلا گیا۔

برطانیہ سے واپسی کے کافی عرصے بعد میں نے دہلی میں مصری سفارت خانے سے پھر رابطہ قائم کیا تا کہ اشرفیہ کی اسناد کا جامعہ ازہر سے معادلہ ہو جائے اور ہمارے بچے وہاں جانے لگیں، سفارت خانے والوں نے مجھ سے کہا کہ معادلے کے لیے آپ ان کاغذات کے ساتھ ایک درخواست شیخ ازہر کے نام مصر بھیجئے اور اس کی ایک کاپی ہمیں بھی دیجیے۔ پھر میں نے مولوی یلیین اختر کے ساتھ تمام کاغذات تیار کرا کے مبارکپور بھجوائے تا کہ وہ لوگ اپنی مہر و دستخط اور ضروری کاغذات کے ساتھ مصر بھیج دیں، لیکن وہ بھی مردہ خانے میں چلا گیا۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب کمزوری ہماری طرف سے ہو تو دوسروں سے کیا شکوہ؟ مبارکپور میں ایک عجیب سوچ یہ ہے کہ ادارہ کی ذمہ داری سنبھالنے یا نظم ونسق کے لیے مبارکپوری ہونا بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ حضرت حافظ ملت نے تو اپنے آخری ایام میں مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ جمشید پور کسی معتمد کے حوالے کر کے مبارکپور تشریف لے آئے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے ہر وقت حاضر ہوں، لیکن آپ جانتے ہیں کہ اہل مبارکپور کا ذہن کیا ہے، میں غلطیوں پر نشاندہی کروں گا اور لاپرواہی کو

برداشت نہیں کرں گا، ایسی صورت میں میں ان کے لیے نا قابل برداشت ہو جاؤں گا، تو جو بھی ہمارا آنا جانا ہے وہ بھی بند ہو جائے گا، تو حضرت لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھ گئے اور بڑے غصے اور جلال میں فرمایا کہ" جو آپ کو ہٹائے گا وہ خود ہٹ جائے گا-" اس کے کچھ دنوں کے بعد پھر حضرت کا وصال ہو گیا- حاصل یہ کہ جب تک کچھ کرنے کا اختیار آدمی کو خود نہ ملے وہ کچھ نہیں کرسکتا، جہاں تک مشورے دینے کا تعلق ہے میں دیتے رہتا ہوں اور اپنے بل پر جو کچھ کر سکتا ہوں وہ کرتا رہتا ہوں۔ اس کے باوجود محسوس کرتا ہوں کہ اہل مبارکپور جو بھی کام کر رہے ہیں، غنیمت ہے اور وہ اہل سنت کی جانب سے شکریے اور دعاؤں کے مستحق ہیں۔

سوال:-حضرت حافظ ملت کی کچھ خصوصیات بتائیں جنہیں آپ نے سفر و حضر میں خود محسوس کیا؟

جواب:-میرے نزدیک حضرت حافظ ملت کی چند ایسی خصوصیات ہیں جو دوسرے علماء سے انہیں نمایاں طور پر ممتاز کرتی ہیں جن کو میں نے بار بار محسوس کیا۔ ان خصوصیات میں ایک تو یہ تھی کہ ان کی نجی محفلوں میں بھی ہم نے کبھی ان کے معاصر علماء کے بارے میں شکایت یا غیبت کرتے نہیں سنا، جبکہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ معاصرت کے جذبے میں لوگ اپنے معاصرین کو گرانے کے لیے ان کی شکایتیں کرتے ہیں اور ان کی کمزوریوں کو بے نقاب کرتے ہیں، خاص طور پر اپنے معتقدین اور مریدین کو ان سے الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ یہ مریدین بلا شرکت غیرے صرف انہی کے ہو کر رہ جائیں۔ حافظ ملت میں یہ بات نہیں تھی، وہ کبھی کسی کی بھی غیبت نہیں کرتے تھے یا اپنے معاصرین کی شکایت اپنے تلامذہ یا اپنے مریدین کے سامنے نہیں کرتے تھے اور نہ اس سے ان کو کوئی خاص دلچسپی تھی، ان کی محفل میں اس طرح کا کوئی ذکر ہوتا ہی نہیں تھا، جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس بیماری سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ حافظ ملت کی اس صفت سے میں بے حد متاثر تھا، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ الجامعۃ الاشرفیہ کو ایک عالمی اور آفاقی ادارہ بنانے کے لیے حافظ ملت نے جو اقدامات کیے تھے ایک طبقہ شدت کے ساتھ اس کا مخالف تھا جسے آپ بھی جانتے ہیں، اور مخالفت کبھی کبھی ایسی ہوتی تھی جسے ہم بازاری سطح کی کہہ سکتے ہیں۔ مگر حافظ ملت خاموش

رہتے اور فرماتے کہ دعا کرو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ دلوں کے دروازے کھول دے، وہ ہماری نیتوں سے واقف ہے کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔

دوسری بڑی خوبی جو میں نے حافظ ملت میں محسوس کی وہ تھی اخلاص اور دین کا صحیح درد۔ اس میں ذرہ برابر بھی اپنی نمائش نہیں تھی، یعنی اپنے آپ کو، اپنے علم وفضل کو، اپنی بزرگی کو یا اپنے سلسلۂ طریقت کو نمایاں کرنے کا ذرہ برابر بھی ان کے اندر جذبہ نہیں تھا۔ عام طور پر میں دیکھتا ہوں کہ پیر حضرات اپنے مریدوں کا مخصوص حلقہ بناتے ہیں، اپنی بزرگی اور کرامتوں کی تشہیر کے لیے اوراڑانے کے لیے کہ تم لوگ مجھے اڑاؤ۔ حافظ ملت کے مریدین کا بھی ایک وسیع حلقہ تھا، لیکن ان کے یہاں اس طرح کا کوئی کاروبار نہیں ملتا ہے، اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کے بیعت وارشاد کا جو سلسلہ تھا وہ بھی اخلاص ہی پر مبنی تھا، اس سے ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ میری دکان بڑھے یا ہمارے معتقدین کا حلقہ وسیع ہو اور ہمارے کاروبار میں توسیع ہو۔

تیسری چیز جو میں عام طور پر لوگوں کے یہاں دیکھتا ہوں کہ پیران عظام اور اکابر علماء اپنی زندگی میں اپنے بیٹوں کو اپنا جانشین بنانے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں اپنے ساتھ اپنے حلقوں میں متعارف کرانے کے لیے لے جاتے ہیں۔ مگر حافظ ملت کی زندگی میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کبھی بھی انہوں نے یہ کوشش نہیں کی کہ اپنے صاحبزادے کو نمایاں کریں یا اپنا جانشین بنائیں یا اس کے لیے اشارہ دیں۔ اشارہ اور کوشش کی بات تو الگ ہے بلکہ کوشش اس بات کے لیے کی کہ وہ پس پردہ ہی رہیں تبھی تو وہ اپنے صاحبزادے کو اپنی زندگی میں الجامعۃ الاشرفیہ کے کسی عہدے پر یا کسی شعبے میں نہیں رکھا۔ یہ تو حضرت کے وصال کے بعد چہلم میں جب سارے اکابر تشریف لائے تو سبھوں نے اتفاق رائے سے مولانا عبدالحفیظ صاحب کو حضرت کا جانشین نامزد کیا، حضرت حافظ ملت نے تو خلافت بھی نہیں دی تھی اور نہ مرید کیا تھا، چنانچہ چہلم کے موقع پر حضرت برہان ملت نے انہیں سلسلۂ قادریہ میں داخل کیا اور انہیں خلافت دی، پھر اسی دن حضرت برہان ملت، حضرت مجاہد ملت، حضرت امین شریعت اور رحمانی میاں ودیگر اکابر اہل سنت نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ حافظ ملت کے جانشین ہونے کی حیثیت سے مولانا عبدالحفیظ صاحب کو ہی جامعہ اشرفیہ کی سربراہی سونپی جائے،

چنانچہ انہوں نے مجلس منتظمہ کے ممبران وارکان کو بلوایا اور ان کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔ اس پر انہوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا بلکہ کہا کہ ہم لوگوں کی بھی خواہش یہی ہے کہ مولانا عبد الحفیظ صاحب ہی ادارہ کے سربراہ بنیں، اس طرح حافظ ملت کی جدائی کا جو غم ہے وہ آہستہ آہستہ کم ہو جائے گا اور ہم محسوس کریں گے کہ مولانا عبدالحفیظ صاحب کی شکل میں آج بھی حافظ ملت ہمارے درمیان موجود ہیں، چنانچہ انہیں سربراہ بنا دیا گیا، یہ جو کچھ بھی ہوا حضرت حافظ ملت کے وصال کے بعد ہوا، اپنی زندگی میں نہ تو وہ اپنے صاحبزادے کو کبھی اپنے مریدین میں لے گئے اور نہ انہوں نے کبھی یہ سوچا کہ میرے بعد میرا بیٹا میرا جانشین ہوگا۔

تین باتیں ہو گئیں، چوتھی بات یہ تھی کہ عام طور پہ لوگ جلسوں میں جاتے ہیں تو تقریر کیا، نذرانہ لیا اور چلے گئے، وہ وہاں کے مسائل کا جائزہ نہیں لیتے، دین کو زندہ رکھنے، لوگوں کی اصلاح اور سنیت کی بقا کے لیے وہ خطہ وہ علاقہ کیا چاہتا ہے، اس کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں ہوتی، لیکن حافظ ملت جہاں بھی تشریف لے جاتے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ پروگرام ختم ہونے کے بعد وہ پوچھتے تھے کہ یہاں کوئی دینی ادارہ ہے کہ نہیں؟ یہاں کوئی اسلامی مرکز ہے کہ نہیں، یہاں سنیوں کی آبادی کتنی ہے، مسلمان کتنی تعداد میں آباد ہیں، ان کے اخلاقی و دینی حالات کیسے ہیں؟ مالی حالت کیسی ہے؟ ان حالات سے باخبر ہونے کے بعد اگر ضرورت محسوس کرتے تو کوئی مرکز قائم کر دیتے تھے، چنانچہ جمشید پور میں جو میں نے مدرسہ فیض العلوم کے نام سے ادارہ قائم کیا ہے اور جو اس وقت صوبۂ جھارکھنڈ کا سب سے بڑا مرکزی ادارہ ہے وہ بھی انہی کی ایماء پر قائم کیا گیا تھا۔

فراغت کے بعد میں ناگپور چلا گیا تھا اور مدرسہ اسلامیہ میں چھ سات سالوں تک تدریسی فرائض انجام دیتا رہا۔ یہ غالباً ۱۹۵۰ء یا ۱۹۴۹ء کی بات ہے جب، اس کا پہلا گروپ درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد فارغ ہوا، اس میں تقریباً ۹ رعلماء تھے جن میں مفتی جلال الدین امجدی صاحب بھی تھے، اس گروپ کا بخاری شریف کا امتحان لینے لیے حافظ ملت تشریف لائے تھے، جب وہ تشریف لائے تو ان کے تشریف لانے کے موقع پر ناگپور سے مختلف علاقوں کے دورے کا پروگرام ہم نے ترتیب دیا تاکہ مختلف علاقوں میں حضرت کا پروگرام ہو۔ ممبئی سے کلکتہ لائن پر جو ٹرینیں چلتی ہیں اس پر بڑے بڑے شہر تھے، جیسے گوندیا، ڈونگر

گڑھ، رائے پور، بلاسپور، رائے گڑھ، جھارسگوا، راج گانگ پور اور پھر جمشید پور، تو ان تمام علاقوں کا ہم نے پروگرام طے کرلیا۔ مدرسہ اسلامیہ ناگپور کے پروگرام کے ختم ہونے کے بعد حافظ ملت کا ان مذکورہ علاقوں کا پروگرام شروع ہوا، اس دورے میں میں ان کے ساتھ تھا۔ مذکورہ علاقے کا دورہ کرتے ہوئے جب ہم راج گانگ پور پہنچے تو وہاں کا پروگرام ختم کرنے کے بعد حضرت کو مرادآباد جانا تھا، جس کے لیے انہیں جمشید پور آنا تھا، کیونکہ پٹنہ ہو کر مرادآباد جانے کے لیے جمشید پور سے ہی گاڑی ملتی تھی، اس لیے ہم لوگ جمشید پور آ گئے ، وہاں ہمارے ایک ساتھی قاری محمد حسین صاحب ایک مسجد کے امام تھے، اس لیے ہم لوگ ان سے ملنے گئے اور اسی مسجد میں قیام کیا۔ وہاں حافظ ملت نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہاں جمشید پور میں مسلمانوں کی کتنی آبادی ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ تقریباً ایک لاکھ ہے اور بہت خوش حال آبادی ہے، پھر پوچھا کہ مالی حالت کیسی ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اچھی حالت ہے، کیونکہ عموماً لوگ ٹاٹا اسٹیل کمپنی میں کام کرتے ہیں اور سبھوں کی تنخواہیں اچھی ہیں اور بہت سے افراد کاروبار بھی کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ یہاں کوئی دینی تعلیمی ادارہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ نہیں ، یہاں کوئی دینی تعلیمی ادارہ نہیں ہے، آپ نے فرمایا کہ حیرت ہے کہ اتنی بڑی آبادی میں یہاں سے لے کر کلکتہ اور دوسری طرف رائے پور تک کوئی دینی ادارہ نہیں۔ اسی موقع پر حضرت نے مجھے حکم دیا کہ آپ ناگپور سے مستعفی ہو جائیں اور یہاں آ جائیں، میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی یہاں اشد ضرورت ہے، ناگپور سے آپ چلے بھی آئے تو کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوگا، کیونکہ وہاں جامعہ عربیہ تو موجود ہی ہے، اس لیے آپ یہاں آ جائیں، یہاں آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ حضرت حافظ ملت کی ایک عادت تھی وہ اپنے تلامذہ کے ساتھ ''تم'' کہہ کر بات نہیں کرتے تھے بلکہ ''آپ'' کہتے تھے، یہ بھی حضرت کی ایک خصوصیت تھی۔ میں آنکھ بند کر کے حضرت کے حکم پر چلتا تھا، اس لیے میں نے حکم کی تعمیل میں سر جھکا دیا۔ شعبان کا مہینہ تھا، میری آمد کے سلسلے میں کوئی تفصیل طے نہیں ہوئی کہ یہاں میں آؤں گا تو میں کہاں رہوں گا، مجھے بلانے والے کون ہوں گے، کہاں میں کھاؤں پیوں گا، مجھے میرے اخراجات کون دے گا؟ یہ سب کچھ بھی طے نہیں تھا، بس انہوں نے حکم دیا اور میں نے تعمیل میں سر جھکا دیا۔ چنانچہ میں نے ناگپور استعفیٰ بھیج دیا

اور اجمیر شریف چلا گیا اور سرکار غریب نواز میں پورا رمضان کا مقدس مہینہ گزارا، کیونکہ بہت بڑے کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا تھا، جمشید پور سے پورے صوبہ بہار، اڑیسا اور بنگال کو سنیت اور دین کی حفاظت کے لیے مسخر کرنا تھا، یہ بڑا ہی صبر آزما اور مشکل ترین کام حضرت نے ہمارے سپرد کر دیا تھا، اس کے لیے روحانی توانائی چاہیے تھی، اسباب و وسائل کی فراہمی اور جیالے افراد کی ضرورت تھی۔ خیر پورا مہینہ اجمیر گزارنے کے بعد میں عید کی نماز پڑھ کر وہاں سے جمشید پور کے لیے روانہ ہوا —— تو حافظ ملت کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ خود محسوس کرتے تھے کہ کہاں اور کب کس کی ضرورت ہے اور وہاں ادارے قائم کیا کرتے تھے، چنانچہ یہی ذہن میرا بھی ہے اور ان کے اکثر تلامذہ میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں آج جتنے بھی ادارے میں نے قائم کیے ہیں وہ کسی کے کہنے پر نہیں بلکہ خود ضرورت محسوس کرتے ہوئے قائم کر دیا، اگر کہنے کا انتظار کرتا تو بہت سے خطے اسلام و سنیت کے حوالے سے ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے ہوتے۔

☆☆☆